Regd. L. No. 7243
Phone: 880600

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1980

اس پرچہ میں :

(۱) وحدت امت

(۲) مفسدین کا انجام

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ، لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون نمبر ——— ۸۸۰۸۰۰	بدلِ اشتراک
۳ تین روپے	خط و کتابت ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان ۳۲/- روپے غیر ممالک ۲½ پونڈ

جلد ۳۳	جولائی ۱۹۸۰ء	شمارہ ۷

فہرست

۱۔ لمعات ..... (وحدتِ اُمت) ---------- ۲

وحدتِ انسانیت کی طرف پہلا قدم

۲۔ صدرِ پاکستان کی تقریر کے اقتباسات ---------- ۱۱

۳۔ مفسدین کا انجام ----- محترم پرویز صاحب ---------- ۱۸

۴۔ ریکارڈ میں رکھیئے! ---------- ۲۷

۵۔ قرآن فہمی کے اصول ----- علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) ---------- ۳۳

۶۔ باب المراسلات ----- (۱) حقِ وراثت۔ (۲) نماز پڑھنی چھوڑ دی! ---------- ۵۹

۷۔ فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ---------- ۶۱

۸۔ قرآنی درس کے اعلانات وغیرہ ---------- ۶۳

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ۔ لاہور

لمعات

وحدتِ اُمّت

(وحدتِ انسانیت کی طرف پہلا قدم)

قرآن کریم نے کہا ہے، وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً - فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) انسانوں نے جب تمدنی زندگی کا آغاز کیا تو وہ ایک ہی گروہ، ایک ہی جماعت، ایک ہی قوم اور ایک ہی اُمت تھے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور خاندانوں اور قبیلوں میں بٹ گئے اور اس طرح نوعِ انسانی کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔" اس خود پیدا کردہ تفرقہ کا دور کرنا، فکرِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ وحی کی راہ نمائی ہی سے دور ہو سکتا تھا۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ - وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ - لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳) اس کے لئے خدا نے انبیاءؑ کا سلسلہ جاری کیا جو لوگوں کو وحدتِ انسانیت کے خوشگوار نتائج کے مژدے سناتے اور تفرقہ کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتے تھے۔ اس کے لئے وہ زبانی وعظ ہی نہیں کرتے تھے۔ انہیں خدا کی طرف سے ضابطہ و قوانین بھی دیا جاتا تھا جس کی رُو سے وہ انسانوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے، تفرقہ مٹا دیتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے آسمانی راہ نمائی کا منتہیٰ وحدتِ انسانیت ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کی عالم گیر تشکیل۔ اس کے لئے پہلے ایسے انبیاءؑ کرام آتے رہے جو اپنے اپنے حیطۂ کار کے اندر اختلافات مٹا کر وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جب انسانیت اُس دور میں داخل ہوئی، جب ایک عالمگیر وحدت کا امکان ہو گیا تو خدا نے اپنے آخری نبیؐ کو آخری ضابطۂ ہدایت دیکر بھیجا۔ آپ قرآن کریم میں دیکھیں گے کہ اس دعوت کو "للناس" کہا گیا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کے لئے دعوت۔ سب سے پہلے اس نے خدا کے قومی یا نسلی تصور کی جگہ اسے رَبِّ النَّاسِ - مَلِكِ النَّاسِ - اِلٰهِ النَّاسِ۔ (۱۱۴/۱-۳) کہا۔ یعنی کسی خاص نسل، گروہ، یا قوم کا رب اور الٰہ نہیں۔ تمام نوعِ انسان کا رب اور الٰہ۔ جو رسولؐ اُس خدا نے بھیجا اس کے متعلق بھی یہی کہا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۴/۲۸) "اے رسولؐ! ہم نے تجھے تمام عالمِ انسانیت کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن گروہ بندیوں اور قومیت اور وطنیت کے حدود میں گھرے ہوئے ذہن انسانی اس تصور کو جلدی سے نہیں اپنائے گا۔ وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کو سمجھ سکے گا۔"

اس رسولؐ کی وساطت سے اس نے جو ضابطہ و قوانین (قرآن مجید) بھیجا اس کے متعلق بھی وضاحت سے کہہ دیا کہ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (۴۵/۲۰) یہ کسی خاص نسل یا قوم کے لئے نہیں تمام نوعِ انسان کے لئے

وجہ البصیرت ہے۔"

وحدتِ انسانیت کے منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے، اس نے بطورِ آغاز، کار جس قوم کی تشکیل کی (یعنی اُمّتِ محمدیہ) اس کے متعلق بھی وضاحت کر دی کہ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹) "تم بہترین اُمّت ہو جسے تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔"

اس اُمّت کے ہاتھوں جو نظام تشکیل ہونا تھا اس کا مرکز کعبہ قرار دیا گیا، اور کعبہ کے متعلق بھی اس امر کی وضاحت کر دی کہ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ (۳/۹۵) "دنیا میں وہ پہلا گھر جسے نسلوں، خاندانوں، وطنوں اور قومیتوں کی انسانیت سوز گروہ بندیوں سے بلند لے جا کر تمام عالمِ انسانیت کے لئے کھلا رکھا گیا ہے۔ وہ گھر کعبہ ہے جو مکہ مبارک میں واقع، اور جو تمام اقوامِ عالم کے لئے ہدایت کا مرکز ہے۔" مقصد اس سے قِيَامًا لِلنَّاسِ (۵/۹۷) ہے۔ یعنی اس نظام کا مرکز جس سے تمام نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے۔"

"خیر و شر" کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے ہم بتا چکے ہیں کہ نفع اور نقصان کے اضافی معیاروں کی رُو سے ہر فرد (یا زیادہ سے زیادہ) ہر قوم اپنے اپنے نفع کو سامنے رکھتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے مستقل اقدار کے پیمانوں کے مطابق کہا کہ یاد رکھو۔

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

اُسی نظریہ، اُسی نظام، اُسی مسلک کو بقا نصیب ہو سکتی ہے جس کا نصب العین کسی خاص فرد، گروہ یا قوم کا مفاد نہیں، بلکہ تمام نوعِ انسان کی منفعت ہو۔

اقبالؒ کے الفاظ میں:

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق، بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

ہم نے اس مقام پر قرآنِ کریم کے نصب العین — وحدتِ انسانیت — کے سلسلہ میں ایک ایک، دو دو حوالوں پر اکتفا کیا ہے، ورنہ قرآنِ مجید میں یہ تصریحات بکثرت بکھری پڑی ہیں، وہ اپنے اپنے مقام پر سامنے آئیں گی۔ یہاں بتانا صرف یہ مقصود تھا کہ سلسلۂ رشد و ہدایت کی اس آخری کڑی کا مقصد، نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہے، جس کی بنیاد ایمان (آئیڈیالوجی) کا اشتراک ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو نظریہ، جو تصوّر، جو عقیدہ اور جو نظام اس کے خلاف ہوگا یا اس کے راستے میں روڑے اٹکائے گا، وہ قرآنِ کریم کی رُو سے وجہِ فسادِ آدمیت قرار پائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا کی مقرر کردہ صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر دوسرے راستوں کی طرف نکل جانے والے لوگ وہ ہیں — يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ (۲/۲۷) "کہ خدا نے جنہیں ملانے کا حکم دیا تھا وہ ان میں، فرقہ پرستیوں، گروہ بندیوں، قومیت سازیوں کی خلیجیں حائل کر لے اور اس طرح کوشش کرتے ہیں کہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانیت آپس میں ملنے نہ پائے"۔ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (ایضاً) "یہی لوگ ہیں جو دنیا

میں فساد برپا کرتے ہیں۔

محمد رسول اللہ والذین معہ نے وحی کی راہ نمائی میں، اپنے حیطۂ اقتدار کے اندر، ان خلیجوں کو کس طرح پاٹا اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو کس طرح آپس میں جوڑا ـــــ ان کے جسموں اور سروں ہی کو نہیں جوڑا، بلکہ ان کے دلوں کو جوڑا کہ اصل جڑنا دلوں کا جڑنا ہے۔ (۳/۱۰۲) تاریخِ انسانیت اس پر شاہد ہے۔ انہوں نے رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی تفریقات کو مٹا کر اُمّتِ واحدہ کی تشکیل کی، اور اس طرح دنیا کو دکھا دیا کہ وحدتِ انسانیت کا قرآن کا پیش کردہ نظریہ یا تصوّر ناممکن العمل نہیں۔

خود یہ اُمّت ٹکڑوں میں بٹ گئی

لیکن اس کے بعد کیا ہوا، اس کے تذکرہ سے ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ وہی اُمّت جو عالمگیر انسانیت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے کھڑی کی گئی تھی، خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پہلے اس نے دین کو مذہب سے بدل کر، مذہب میں مختلف فرقے پیدا کر لئے، اور اس کے بعد، نسلوں اور وطنوں کے اختلاف کی بنیادوں پر مختلف قوموں میں بٹ گئی۔

وطن کے اختلاف کی بنیادوں پر جداگانہ قوموں کی تشکیل، یورپ کی پیدا کردہ لعنت تھی۔ لیکن ہم نے جو اوپر کہا ہے، نزولِ قرآن سے اس دَور کا آغاز ہوا جس میں (رفتہ رفتہ) انسان بہرحال یہ سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا کہ کونسا راستہ اُسے، آخرالامر کس طرف لے جائے گا۔ یورپ نے باہمی حسد اور نفرت کی بنیادوں پر مختلف قومیتوں کی تشکیل کر لی۔ لیکن جب شدتِ جذبات میں مخفوظ سا سکون پیدا ہوا (یا یوں کہئے کہ جب اِس نظریۂ قومیت کے تباہ کن نتائج سامنے آئے) تو خود وہیں کے مفکرین چیخ چیخ کر پکار اُٹھے کہ یہ نیشنلزم (قومیت پرستی) ہمیں تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم یورپ کے بہت سے مفکرین اور مدبّرین کے اقوال اور آرا پیش کر سکتے ہیں، لیکن بغرضِ اختصار، یہاں صرف چار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مفکّرینِ مغرب کا واویلا

(ALDOUS HUXLEY) وہاں کا ایک مشہور مفکّر ہے جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ وہ اپنی کتاب (SCIENCE, LIBERTY & PEACE) میں لکھتا ہے:-

> نیشنلزم، جسے ہم نے ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے، جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ یہ ان میں سے ہر قوم کا "مملکتی مذہب" ہے۔ یعنی خدا کی بجائے قوم کی پرستش، جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا، اِن پچاس دیوتاؤں میں سے، ہر ایک دیوتا کا پجاری، باقی انچاس پجاریوں کو ملیکشش تصوّر کرتا ہے۔ نیشنلزم، اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رُو سے

جو حضرات تفصیل دیکھنا چاہیں وہ میری تالیف ـــ انسان نے کیا سوچا ہے ـــ میں "سیاست" کا عنوان دیکھ لیں۔

عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں، اس کا وجوب ہوتا ہے۔

یاد رکھیئے! ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے۔

نیشنلزم سے تنگ آ کر دور کے مفکرین، انسانیت کے جس نقشہ کے دیکھنے کے آرزومند ہیں، ایک ہلکی سی جھلک اس کی بھی دیکھنے چاہیئے۔ کیتھولک چرچ کا سابقہ اسقف (TEILARU-DE-CHARDIN) اپنی کتاب (BUILDING OF THE EARTH) میں لکھتا ہے:-

اب اقوام کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کر دیں اور مختلف ملکوں اور خطوں سے آگے بڑھ کر خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسان کو اپنی آغوش میں لے لے۔

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کا آغاز امتِ واحدہ کی شکل میں کیا تھا۔ اس کے دکھوں کا علاج بھی یہ ہے کہ یہ پھر سے امتِ واحدہ بن جائے۔ اس باب میں کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب میں جس کا نام ہی اس نے (THE COMMUNITY OF MAN) رکھا ہے۔ لکھتا ہے:-

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی۔ لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہم گرجوڑ دے۔ انسانیت کے ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

یہ مفکرین جس عالمگیر برادری کو اس وقت نگہ تصور سے دیکھ رہے ہیں، اس کی تشکیل کا طریق کیا ہوگا، اس کے متعلق سویڈن کا مشہور ماہرِ اقتصادیات (GUNNER MYRDAL) لکھتا ہے:-

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھنچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کی خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اور اس کے بعد، یہ مفکر کہتا ہے کہ

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں۔ جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔ (BEYOND THE WELFARE STATE)

اس مذہب کے متعلق، جس کا تصور (MYRDAL) کی روح کے نشیمن میں جلوہ بار ہے، امریکہ کا بین الاقوامی شہرت کا ماہر نفسیات (ERIC FROMM) لکھتا ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو:۔

انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔ (THE SANE SOCIETY.)

اگر (ERIC FROMM) یا اُس کے ہمنوا، دیگر اربابِ فکر کے سامنے قرآن مجید ہوتا تو وہ اس میں دیکھ لیتے کہ جس مذہب کی نمود کے وہ اس شدت سے آرزومند ہیں وہ پہلے سے اِس کتابِ عظیم اندر الدین کی شکل میں موجود ہے لیکن چونکہ وہ محسوس شکل میں غیر تو غیر، خود اس کتاب پر ایمان رکھنے کے مدعیوں کے ہاں بھی موجود نہیں، اس لئے وہ اس کی نمود کے منتظر ہیں۔ بے شک، بحالاتِ موجودہ، اس کی نمود زمانے کے تقاضوں ہی کی رو سے ہوگی، اور اربابِ بصیرت کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ اس کے لئے اب کوئی لمبا عرصہ درکار نہیں ہوگا۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا!

بہرحال، یہ ہے وہ عالمگیر فساد جس کے متعلق قرآن کریم نے یہ کہا تھا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔ (۳۰/۴۱) "انسانوں کے خودساختہ نظاموں کی وجہ سے خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد برپا ہو گیا"۔ اُس دور کی اُمتِ مسلمہ (یعنی محمد رسول اللہ والذین معہ) نے اس فساد کو اصلاح میں بدلا اور اسی جہت سے قرآن کریم نے انہیں مصلحین کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مؤمنین اور کفار کی طرح، مفسدین اور مصلحین، ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ (۴۷/۲۲) اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ان دونوں کی زندگی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ - أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ (۳۸/۲۸) "ایسا ہو نہیں سکتا کہ ہم ان لوگوں کو جو ایمان اور اعمالِ صالح کے پیکر ہوں، فساد کرنے والوں کے برابر کر دیں۔ یعنی متقین اور فجار ایک جیسے ہو جائیں"۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو یونہی بے کار پیدا کر رکھا ہے۔ (۳۸/۲۷) مفسدین کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ ان کے برعکس، وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ

مصلحین

وَمَآ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱/۱۱۷) "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ خدا اس بستی یا قوم کو تباہ کر دے جو مصلحین پر مشتمل ہو، ایسا کرنا ظلم ہوگا۔ اور خدا کبھی ظلم نہیں کرتا۔" اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (۷/۱۷۰) "ہم مصلحین کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔"

آخر میں سوال یہ سامنے آئے گا کہ یہ مصلحین کہاں لوگوں کو جائے گا، ایسا بنا کس طرح جائے گا، قرآن کریم نے اس کا جواب دو لفظوں میں دے دیا ہے، وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۷/۱۷۰) "مصلحین وہ ہوتے ہیں جو قرآن کریم سے متمسک رہتے ہیں اور اس کی روشنی میں وہ نظام قائم کرتے ہیں جسے اس نے صلوٰۃ کا نظام کہہ کر پکارا ہے۔"

یہ نظام نہ کسی خاص مقام یا زمانہ تک محدود تھا اور نہ ہی ناممکن العمل۔ قرآن کریم خدا کی زندہ و پائندہ کتاب ہے اور اس میں قیامت تک یہ صلاحیت موجود ہے کہ اس کی رو سے ایسا نظام قائم کیا جا سکے جو دنیا کے فساد کو اصلاح میں بدل ڈالے۔

بالفاظِ دیگر، امتِ مسلمہ کا فریضہ یہ تھا کہ نوعِ انسان کی عالمگیر وحدت پیدا کرے اور اس کے لئے قدمِ اوّل یہ تھا کہ وہ خود اُمتِ واحدہ بنے۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں یہ پہلا قدم اٹھایا گیا۔ اور نہایت کامیابی سے اٹھایا گیا۔ لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) یہ اُمت بھی، دیگر اقوامِ عالم کی طرح، مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اس کی یہ کیفیت آج تک چلی آ رہی ہے۔ دنیا کے ایک ارب (یا کم از کم نوّے کروڑ) مسلمانوں کی آبادی، نسلی یا وطنی تفریقات کی بناء پر مختلف قوموں میں بٹی ہوئی ہے۔ حالانکہ انہیں، اسلام کی قدرِ مشترک کی بنا پر ایک اُمت ہونا چاہئے تھا۔

یہ شگون نیک ہے کہ اب ان مسلم اقوام میں یک جا ہونے کا احساس اُبھر رہا ہے۔ لیکن اس کا مقصد مشترک مقاصد (یعنی مشترک خطرات کی مدافعت) کے لئے اتحاد ہے۔ وحدتِ اُمت نہیں۔ وحدتِ امت اس وقت وجود میں آئے گی جب مسلم قومیتوں اور نسلوں کے امتیازات مٹ جائیں گے اور تمام مسلمان صرف مسلمان (مومن) ہونے کی حیثیت سے پہچانے جائیں گے۔ قومیتوں کی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے، اتحاد کا احساس اقوامِ مغرب کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ اس کے لئے انہوں نے پہلے لیگ اوف نیشنز کی بنیاد رکھی اور اس کی ناکامی کے بعد اقوامِ متحدہ (U.N.O) کا ادارہ قائم کیا۔ کیا اس قسم کی کوششیں اقوامِ عالم میں وحدت پیدا کر سکیں گی، اس کے متعلق ہم سے نہیں، خود مغرب کے مفکرین کی زبان سے سنیئے۔ وہاں کا ایک نامور سیاسی مفکر (EMERY REVES) اپنی کتاب (THE ANATOMY OF PEACE) میں لکھتا ہے:-

> لیگ اوف نیشنز ناکام رہ گئی۔ اس لئے کہ وہ انٹرنیشنلزم کے غلط عقیدہ پر قائم ہوئی تھی۔ اس عقیدہ پر کہ مختلف قوموں کے درمیان صلح قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نمائندوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے اختلافی معاملات کا تصفیہ بحث و تمحیص کے ذریعے کر لیا کریں۔ (کس قدر غلط تھا یہ تصوّر) ان تنازعات کا حل ممکن ہی نہیں

جب تک قوموں کے باہمی تعلقات کی بنیاد میں اصلاح نہ ہو جائے۔ (یعنی خود نیشنلزم کے عقیدہ میں اصلاح)۔ (صلہ ۱۶۱)

اس کے بعد مسٹر (REVES) اس مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں لکھتا ہے:۔

ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ ایسا مسئلہ نہیں جسے قومیں حل کر سکیں۔ (وہ تو خود قوموں کے وجود کا پیدا کردہ مسئلہ ہے)۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں فساد برپا کر دیا ہے) لہٰذا، یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کرلے؟ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت (UNIVERSALISM) میں ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر، خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ (صلہ ۱۶۴)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ خود اقوامِ مغرب، اپنی قومی تفریقات سے تنگ آکر انسانیت کا مستقبل اس سمت کی طرف دیکھ رہے ہیں جسے قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے متعین کیا تھا ——— یعنی وحدتِ انسانیت!

یہ عظیم مقصد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے، اس کے متعلق مغرب ہی کے ایک اور مفکر (FREDERICH HERTZ) نے کہا ہے:۔

اب اس حقیقت کو ہر ایک محسوس کر رہا ہے کہ خالی انٹرنیشنلزم کی کوئی مشینری بھی کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر اس میں صحیح روح نہیں۔ لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ روح کس طرح پیدا ہو اور قوموں میں کس طرح پھونکی جائے۔ اس کے لئے بڑے بڑے بلند آہنگ دعاوی کچھ کام نہیں دے سکتے۔ نہ ہی یہ کہہ دینا کافی ہے کہ قومیں از خود اپنے اندر اس روح کو عام کریں۔ اس کے لئے ایک عملی اسکیم اور تربیت کرنے والوں کی جماعت کی ضرورت ہے۔ یہ تعلیم و تربیت وحدتِ انسانی کے جذبہ کو بیدار کرنے کے لئے ہو گی۔ اس کے لئے صرف اسکول بھی صحیح مقام نہیں۔ اس کا تعلق زندگی کے تمام اہم سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات سے ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ دنیا کی تمام اقوام اپنے اپنے ہاں ایک جیسے معاشی اور معاشرتی نظام قائم کریں۔

(NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS. P.412)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ مفکر کس طرح قرآن کریم کے الفاظ کو دہرا رہا ہے۔ جب کہتا ہے کہ وحدتِ انسانیت کے لئے وحدتِ نظام لاینفک ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وحدتِ نظام، خارجی قوانین کی وحدت کی رو ہی سے ممکن ہے۔ یہ وجہ ہے جو اس نے وحدتِ اُمت کے لئے تمسک بالکتاب کو بنیاد قرار دیا ہے مسلمانوں کی مختلف قوموں میں وحدت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب ان کے سیاسی، معاشی،

معاشرتی نظام یکساں ہوں۔ یعنی ہر جگہ قرآنی نظام قائم ہو۔
نیشنلزم کی رو سے پیدا ہونے والی الجھنوں کے حل کے سلسلہ میں آئن سٹائن نے کہا تھا کہ:۔

میرے نزدیک ان الجھنوں کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ہر مملکت کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ وہ دوسری مملکتوں کے ساتھ اختلافی مسائل کا حل بین الاقوامی ادارۂ عدل کی وساطت سے کرا سکے۔ اس مرکزی ادارہ کے پاس اتنی عسکری قوت ہونی چاہیئے کہ وہ کسی مملکت کو دوسری مملکت کے خلاف جنگ کرنے سے جبراً روک سکے۔

(OUT OF MY LATER DAYS)

ہم سردست اس نکتہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہ اس قسم کا ادارۂ عدل وجود میں کیسے آئے گا، اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اُمت میں (ممکنہ) اختلافات مٹانے کے لئے یہی حل تجویز کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ ۔ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۔ (۴۹/۹-۱۰)

اگر کبھی (سوءِ اتفاق سے) ایسا ہو کہ مومنین کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں فوراً صلح کرا دو۔ اگر اس کے بعد ایک فریق دوسرے فریق پر زیادتی کرے، تو اس زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف جنگ کرو تا آنکہ وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئے جو قانونِ خداوندی کی رو سے کیا گیا تھا۔ اگر وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئیں تو ان میں عدل اور انصاف کی رو سے صلح کرا دو۔ اور ہمیشہ عدل کو ملحوظ رکھو۔ یہ چیز قانونِ خداوندی کی رو سے بڑی مستحسن ہے۔
یاد رکھو! مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ سو ان میں صلح کراتے وقت اس حقیقت کو ملحوظ رکھو کہ یہ مصالحت دو بھائیوں میں کرائی جا رہی ہے —— دشمنوں میں نہیں۔ اس کے لئے قانونِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ اس سے تم رحمتِ خداوندی کے مستحق رہو گے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اقدامات امت کی مرکزی اتھارٹی (سنٹرل گورنمنٹ) کی طرف سے کئے جائیں گے جس کے پاس اپنے فیصلوں پر عمل کرانے کی پوری پوری قوت ہوگی۔
یہ تو رہیں اُمت (یعنی اُمت کے باہمی) معاملات کے متعلق۔ جہاں تک دیگر اقوام کا تعلق ہے، قرآنِ کریم نے اس اُمت کا منصب شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) قرار دیا ہے۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کے کردار پر نگاہ رکھنے

والی اُمّت۔ لہٰذا، وہ ادارۂ عدل جس کا تصوّر آئن سٹائن نے دیا تھا، اُمّتِ مسلمہ کی مرکزی اتھارٹی ہوگی جو تمام نزاعی امور کا فیصلہ قرآنِ کریم کی رو سے کرے گی۔

یہ تو (سرِدست) بہت دور کی بات ہے۔ آغازِ کار کے لئے یہ ضروری ہے کہ

۱۔ مسلمانوں کی مختلف مملکتیں اپنے اپنے قومی تشخص کو ختم کرکے 'امتِ واحدہ' بن جائیں۔

۲۔ اس امت کا ایک ہی نظام ہو جو قرآن کریم کی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔

۳۔ ان کے اختلافی امور کا فیصلہ اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کرے جس کے پاس اپنے فیصلے منوانے کے لئے پوری پوری قوت ہو۔

اگر یہ صورت نہ ہو تو مسلمانوں کی مختلف مملکتوں میں ہنگامی خطرات کی مدافعت کے لئے (زیادہ سے زیادہ) باہمی اتحاد کی شکل پیدا ہو سکے گی (اور وہ بھی ان میں جن کے لئے وہ خطرہ مشترک ہو)۔ اسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں انٹرنیشنلزم کہا جا سکے گا۔ امت کی وحدت نہیں کہا جا سکے گا جو اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ یہ اسی قسم کا اتحاد ہوگا جس کی رُو سے (مثلاً) ایران اور عراق کے مندوبین، اسلامی وزراء خارجہ کی کانفرنس میں بیٹھے اتحادِ اسلامی پہ تقریریں کر رہے تھے اور ان کی فوجیں میدانِ جنگ میں برسرِپیکار تھیں بعینہٖ وہی کچھ جو (U.N.O.) میں ہوتا ہے۔ بحالاتِ موجودہ اگر مسلم مملکتوں کی خارجہ پالیسی بھی ایک ہو جائے تو یہ نہ صرف ان کے تحفظ کی بہت بڑی ضمانت ہو جائے گی بلکہ اس سے ان کا وزن بھی بہت بڑھ جائے گا۔ یہ جس قوم کے ساتھ ہوں تو سب ساتھ ہوں۔ جس کے خلاف ہوں تو سب خلاف ہوں۔ اگر کسی قوم نے ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا ہو تو وہ ان کی نمائندہ جماعت سے بات کرے اور اس کا فیصلہ سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ اگر سرِدست اتنی سی پیش رفت بھی ہو جائے تو بصد غنیمت ہے۔

قرآنی قوانین

الحمدللہ کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف ——— قرآنی قوانین ——— ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے۔ اور اس کی افادیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد (مجلد) بیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

صدرِ پاکستان کی تقریر

۱۳ جون ۱۹۸۰ء کی شب، صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے قوم سے خطاب کیا۔ ان کی یہ تقریر، جو قریب سوا گھنٹے پر مشتمل تھی، ٹی۔ وی۔ اور ریڈیو پر نشر ہوئی۔ ذیل میں اس تقریر کے ضروری اقتباسات، روزنامہ مشرقی (لاہور) کی ۱۴ جون کی اشاعت سے اخذ کر کے درج کئے جاتے ہیں:

۱- انصاف ملنے میں تاخیر

عوام کی جو توقعات مارشل لاء سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ان میں سرفہرست انصاف کا حصول ہوتا ہے اگرچہ متعدد عدالتیں عام حالات میں مصروفِ عمل رہتی ہیں لیکن جونہی مارشل لاء لگتا ہے ہزاروں افراد حصولِ انصاف کے لئے مارشل لاء حکام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا انہیں مارشل لاء عزیز ہے۔ یا انہیں خدانخواستہ عدل کے روائتی مرکزوں سے شکایت ہے۔ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ وہ پیچیدہ عمل ہے۔ جس کے باعث حصولِ انصاف میں بہت زیادہ وقت اور پیسے صرف ہوتے ہیں۔ بعض اوقات انصاف کا متلاشی کچہریوں کے چکر لگاتا لگاتا اس دارِ فانی سے ہی کوچ کر جاتا ہے۔ اس وقت بھی صرف ملک کی اعلیٰ عدالتوں میں پونے دو لاکھ مقدمات فیصلہ طلب پڑے ہیں۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ذیلی عدالتوں میں فیصلہ طلب مقدمات کی تعداد کتنی ہوگی ان مقدمات کا فیصلہ کب ہوگا اور کس خوش قسمت کو اپنی زندگی میں انصاف پانے کی خوشخبری ملے گی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمیں جب مارشل لاء لگانا پڑا تو میں نے اپنی پہلی نشری تقریر میں کہا تھا کہ ملک کی عدلیہ کے لئے میرے دل میں بہت احترام ہے میری کوشش ہوگی کہ ممکن حد تک عدلیہ کے اختیارات محدود نہ ہوں تاہم بعض ناگزیر حالات میں خصوصی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے مارشل لاء آرڈر وغیرہ جاری کرنا ضروری تھا جو آرڈر یا مارشل لاء ریگولیشن جاری ہوں گے انہیں کسی سول عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔

بعض مقدمات کے فیصلوں پر عمل نہ ہو سکا اور بعض مقدمات جن کی کارروائی جاری تھی۔ ابھی تک فیصلہ طلب پڑے ہیں اس صورت کا جائزہ لینے کے بعد ہمیں چند روز قبل یہ ناگزیر فیصلہ کرنا پڑا کہ فوجی عدالتوں کے دائرہ کار کو ۳۵ جرائم سے کم کر کے ۸ سنگین جرائم تک محدود کر دیا جائے اور ان جرائم سے متعلق فوجی عدالتوں کے فیصلوں کو عدالتوں کے دائرہ کار سے خارج کر دیا گیا۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے بہت سے باشعور لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ مارشل لاء کو مارشل لاء کی طرح چلایا جائے اور یہ بھی کہا کہ ۱۹۷۳ء کا آئین منسوخ کر دیا جائے یہ ایک آسان راستہ تھا جسے میں ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو بھی اپنا

سکتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ اگر آئین منسوخ کئے بغیر مارشل لاء کا مؤثر نفاذ عمل میں آسکتا ہے تو انتہائی قدم اٹھانے کی کیا ضرورت ہے اب تک میں اس فیصلے پر عمل کرتا رہا۔ گزشتہ سال مارشل لاء کو مؤثر بنانے کے لئے آئین کی دفعہ ۲۱۲ میں ایک شق کا اضافہ کر دیا کہ سنگین مقدمات کو سول عدالتوں کے دائرہ اختیار سے خارج کر دیا جائے جو فوجی عدالتوں میں زیر سماعت ہیں یا زیر سماعت آسکتے تھے مگر افسوس کا مقام ہے کہ اس ترمیم کے مقاصد پورے نہ ہو سکے۔ فوجی عدالتوں کے فیصلوں پر سول عدالتوں نے حکم امتناعی جاری کرنا شروع کر دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مارشل لاء انتظامیہ حسب معمول غیر مؤثر رہی اور عوام پہلے کی طرح حق و انصاف سے محروم رہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کا فائدہ کسے پہنچا۔ ڈاکوؤں کو قاتلوں کو اغواء کرنے والوں کو یا بے چارے عوام کو اس کارروائی کی وجہ سے کئی رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔

میں آج بھی اپنے اس وعدے پر قائم ہوں اور عدلیہ کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ گزشتہ دو ڈھائی سال میں ہم جن تجربات سے گزرے ہیں ان سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ عدلیہ کا احترام اپنی جگہ بہت مقدم ہے لیکن عوام کی روزمرہ کی مشکلات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہمارا نظام انصاف نہایت پیچیدہ ہے۔

۲۔ انصاف بلا تاخیر ملنا چاہیئے

صدر نے کہا کہ حصول انصاف کو آسان بنانے کے بارے میں ہمارے اقدامات کا مقصد عدلیہ کے وقار کو کم کرنا نہیں ہے، ہم یہ چاہتے ہیں، رشوت، سمگلنگ اور ڈاکہ زنی کے مجرموں کو بلا تاخیر سزا دی جا سکے اور اگر کوئی بدمعاش کسی عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالے تو اسے عبرت ناک سزا دی جائے، اگر کسی کے لخت جگر کو کوئی درندہ صفت انسان اغواء کرلے تو اسے درندگی کا خمیازہ فوری طور پر بھگتنا پڑے، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ ڈاکو کو کھلے بندوں ڈاکہ ڈالتے دیکھیں مگر اسے صرف اس لئے سزا نہ دے سکیں کہ عدالت کے پاس پہلے ہی ہزاروں کیس سماعت کے لئے پڑے ہیں، یہ کہاں کا قانون ہے کہ کسی معصوم کو دن دہاڑے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا مگر مقتول کے وارث حصول انصاف کے لئے برسوں انتظار کرتے رہیں۔ قانون کی کیسی بالادستی ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا ملک دشمنی پر اتر آئے اور آپ اس پر صرف اس لئے ہاتھ نہ ڈال سکیں کہ کسی عدالت نے یہ مقدمہ محض فوجی عدالت میں زیر سماعت ہونے کی وجہ سے متعلقہ فرد کو ضمانت پر رہا کر دیا ہے۔ ایسے قانون اور طریق کار پر یقیناً نظر ثانی ہونی چاہیئے کہ عدلیہ کے احترام کے ساتھ ساتھ قوم کو اب جرائم پیشہ لوگوں سے بچانے اور انصاف دلانے کا میں ذمہ دار ہوں اور میں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔

۳۔ شریعت بنچیں

ہم نے ملکی قوانین کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے اور ان قوانین کے نفاذ کے عمل کو تیز تر کرنے کے لئے ہر ہائی کورٹ میں ایک شریعت بنچ مقرر کیا تھا جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ کسی کی درخواست پر یا از خود مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر یہ نشاندہی کرے کہ کون سا قانون کس حد تک غیر اسلامی ہے تاکہ اس کی جگہ اسلامی

قانون نافذ کیا جاسکے، یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ ان بنچوں کی کارکردگی توقعات سے بہت کم رہی۔ ان بنچوں کے قیام سے لے کر اب تک انہیں کل دو سو کے قریب کیس بھیجے گئے، جن میں سے صرف ۸۶ مقدمات پر فیصلہ سنایا جاسکا۔ مجھے خود ہائی کورٹ کے ایک جج صاحب نے بتایا کہ اکثر ایسے مقدمات کے لئے بنچ ہفتے میں صرف آدھ گھنٹہ وقت دیتے تھے اور باقی وقت دیگر کاموں میں صرف کرتے تھے۔

میں نے اس صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لئے صوبائی بنچوں کو ختم کر کے ایک وفاقی شرعی عدالت جسے ہم فیڈرل شریعت بنچ کہتے ہیں قائم کر دی ہے جو چیئرمین سمیت پانچ ارکان پر مشتمل ہے یہ عدالت وفاقی یا صوبائی حکومت یا کسی بھی شہری کی درخواست پر یا از خود کسی بھی مروجہ قانون کا جائزہ لے سکے گی۔ اس کے غیر اسلامی پہلوؤں کی نشاندہی کر سکے گی اور متعلقہ قانون کو اس کی غیر اسلامی حد تک کالعدم بھی قرار دے سکے گی۔ یہ عدالت مستقل ہوگی اور ہمہ وقتی بنیاد پر کام کرے گی۔ عدالت اپنا طریق کار خود وضع کرے گی۔ جید علماء، وکلاء، محققین، ماہرینِ قانون اور تمام دوسرے لوگوں کی مدد حاصل کرے گی۔ جو مروجہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں ہاتھ بٹا سکیں۔

میں خود اور پاکستان کے عوام اس عدالت سے بہت سی توقعات رکھتے ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ اپنی کارکردگی سے ہم سب کی توقعات کو پورا کرے گی۔

۴۔ تدریجی پروگرام

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے جس کی قوت اس کا نظریہ ہے اور جس کے نگہبان اس کے عوام ہیں۔ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ نظریہ اسلام سے ہماری محبت کا ثبوت ہماری زبان سے ہی نہیں ہمارے افعال سے بھی ملنا چاہیئے۔ میرا ہی نہیں بلکہ محبانِ وطن اور اسلام پسند عوام کا جی چاہتا ہے کہ ہم جلد از جلد پاکستان میں اسلامی قدروں اور اسلامی اصولوں کو ہر شعبہ زندگی میں جاری و ساری کر سکیں۔ لیکن ایک طویل عرصے سے ہم اسلامی طرزِ زندگی سے عملاً اتنی دور ہو چکے ہیں کہ ہم قرآنِ حکیم کو مکمل ضابطہ حیات تو تسلیم کرتے ہیں مگر ہم میں سے کچھ ایسے ہیں جو اُسے اپنانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ اگر اس کا کوئی فوری حل ہوتا تو میں بلا جھجک اسے فوری نافذ کر دیتا میں دل سے محسوس کرتا ہوں کہ نفاذِ اسلام کے لئے تدریجی طریقہ بہتر ہے جو بظاہر سست رفتار اور صبر آزما ہوتا ہے مگر اس کے ذریعے اگر انسانی زندگی میں کوئی تبدیلی لائی جائے تو وہ زیادہ دیرپا اور مستقل ہوگی۔

صدر نے کہا کہ اس سلسلے میں پہلے جو پیش رفت ہو چکی ہے اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ نفاذِ اسلام کے عمل کو تیز تر کرنے کے لئے حال ہی میں کچھ اقدامات کئے گئے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا نیا سربراہ مقرر کیا گیا ہے کونسل کے نئے چیئرمین کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ کونسل کو مزید فعال بنائیں گے اور اس کے کام کی رفتار کو تیز کر دیں گے۔ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق سربراہ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنہوں نے بہت سے مفید کام سرانجام دیئے ہیں اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

۵۔ اسلامی نظام کا نفاذ

جب میں اسلامی نظام کے نفاذ کا ذکر کرتا ہوں تو میرے پیشِ نظر دو کام ہوتے ہیں اوّل وہ اسلامی اقدار جنہیں اپنانا ہر فرد کا کام ہے اور دوسرے وہ قوانین جو حکومت کو نافذ کرنا ہیں۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل میں افراد کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ہماری روزمرّہ زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیئے کہ جب نماز فرض ہے تو کیا ہم نے نماز ادا کر کے یہ فرض پورا کیا ہے۔

اسلامی قوانین کے نفاذ میں مشکلات دور کرنے کے لئے بھی حکومت نے بعض اہم اقدامات کئے ہیں اس مقصد کے لئے اسلامی یونیورسٹی قائم کی جا رہی ہے جو اس سال کام شروع کر دے گی۔ ہمارے ہاں ایسے تربیت یافتہ افراد کی کمی ہے جو اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں قانونی ذمہ داریاں سنبھال سکیں۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے گزشتہ سال قائداعظمؒ یونیورسٹی میں شرعیہ فیکلٹی کا آغاز کیا تھا مجھے یہ اعلان کرتے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اس سال سے اس شعبہ کو وسعت دے کر باقاعدہ اسلامی یونیورسٹی کا درجہ دیا جا رہا ہے اس یونیورسٹی میں فی الحال شریعت فیکلٹی کے تحت ایل ایل بی اور ایل ایل ایم کی کلاسیں ہوں گی مناسب تیاری کے بعد اس یونیورسٹی میں دوسرے شعبے بھی قائم کر دیئے جائیں گے مجھے امید ہے کہ اسلامی یونیورسٹی کا قیام اسلامی نظام کے فروغ کی طرف ایک مناسب اہم قدم ہوگا اور اس یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے اہم خدمات انجام دیں گے۔

اسلامی نظام کے نفاذ میں سُست رفتاری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسلامی قوانین تو وضع کئے مگر انہیں مروجہ عدالتی نظام کے ذریعے نافذ کرنے اور چلانے کی کوشش نہ کی گویا ایک قسم کی کھچڑی پک گئی تجربہ نے ہمیں یہ بتایا کہ اسلامی قوانین اسلامی طریقے سے ہی نافذ کئے جائیں اس کے لئے مناسب سطح پر قاضی مقرر کئے جائیں گے جنہیں اسلامی قوانین اور فقہ پر پورا پورا عبور حاصل ہوگا ان اسلامی عدالتوں کا واحد کام شرعی قوانین کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کر کے عوام کو فوری انصاف فراہم کرنا ہوگا وہ جرائم جن کے بارے میں شرعی قوانین رائج ہیں۔ ان کے مقدمات کی سماعت صرف انہی شرعی عدالتوں میں کی جائے گی موجودہ عدالتی نظام کو درست کرنا اور اس کی خامیوں کو دور کر کے اسے اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انصاف کے حصول میں تاخیر نہ ہو۔ انصاف صرف کمرہ عدالت تک محدود نہ رہے بلکہ ظالم کے گھر تک پہنچ کر اسے سزا بھی دے جھوٹے کو سزا دی جائے اور سچے کی اعانت کی جائے۔ امیر غریب مرد عورت چھوٹے بڑے غرض ہر ایک کے ساتھ بلا امتیاز انصاف کیا جائے ہم اسلامی روح کے عین مطابق عوام کو عدل و انصاف فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ ماہرین اس بات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ ان شرعی عدالتوں کا دائرہ کار کیا ہوگا۔ اور وہ کس سطح پر قائم کی جانی چاہئیں۔ غور و خوض کے بعد ان ماہرین کی سفارشات کو انشاء اللہ جلد عملی شکل دی جائے گی۔

اسلامی نظام کی عکاسی حکم زکوٰۃ سے ہوتی ہے ہم نے زکوٰۃ کا نظام نافذ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے اس سلسلے میں بعض دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے جنہیں افہام و تفہیم کے ذریعے دور کر لیا گیا ہے۔ مجھے یہ

اعلان کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ زکوٰۃ اور عشر آرڈی ننس کا مسودہ تیار کر لیا گیا ہے کابینہ اس پر دو مرتبہ غور کر چکی ہے اس میں چند ترامیم درکار تھیں جو آج کل کی جا رہی ہیں انشاء اللہ اس حکم کو آئندہ چند روز میں نافذ کر دیا جائے گا۔

۶۔ روٹی کا مسئلہ

گزشتہ تین سالوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور ہمارے مزدوروں، کارخانے داروں، کاشت کاروں اور اداروں کی انتھک محنت سے یہ فرق پڑا ہے کہ آج ہم معاشی تباہی سے بچ گئے ہیں، معیشت میں تنزلی کا رجحان ختم ہو گیا ہے۔

گندم، چاول اور کپاس کی فصلیں رب العزت کے کرم سے بہت اچھی ہوئی ہیں، گزشتہ تین سالوں کے دوران برآمدات میں سو فیصد اضافہ ہوا ہے، مجموعی طور پر ہماری معاشی حالت پہلے کی نسبت بہتر ہو رہی ہے، یہاں ہر کوئی عزت کی روزی کماتا ہے اور آرام کی نیند سوتا ہے اگر غربت دیکھنی ہو تو تیسری دنیا کے کسی اور ملک میں جا کر دیکھئے، جہاں بہت سے لوگ پورا جسم بھی نہیں ڈھانپ سکتے، دو وقت کی روٹی کو بھی ترستے ہیں۔ رات کو سڑکوں پر سوتے ہیں ہمیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ہمیشہ شکر گزار ہونا چاہیئے کہ پاکستان کے حالات نسبتاً بہت بہتر ہیں، مگر اس کے باوجود ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیئے کہ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم اقتصادی، معاشی، دفاعی، غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔

اقتصادی استحکام کی بڑی وجہ اندرونی امنِ عامہ کی تسلی بخش حالت ہے یہاں بھی ہماری مائیں بیٹیوں اور بہنوں کی عزت محفوظ ہے کسی کی پگڑی نہیں اچھالی جاتی۔ یہاں کسی کے دروازے پر آدھی رات کو خطرناک دستک نہیں دی جاتی۔ یہ صورت حال برقرار رکھی جائے گی اور کسی کو امن میں خلل ڈالنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

انتخابات

میں عام انتخابات کرانے کے وعدے پر قائم ہوں موجودہ حکومت ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے جو مضبوط بنیاد رکھے گی اقتدار ایسے لوگوں کے حوالے کیا جائے گا جو اس بنیاد پر مستحکم عمارت تعمیر کر سکیں۔

ملک کو خانہ جنگی اور افراتفری کی دلدل سے نکالنے کے لئے مارشل لاء لگایا گیا تھا۔ ہماری کوشش ہو گی کہ ملک میں دوبارہ ایسے حالات پیدا نہ ہوں۔ صدر صاحب نے کہا کہ انہوں نے عام انتخابات کرانے کا جو وعدہ کیا تھا۔ وہ اس پر قائم ہیں انہوں نے گزشتہ سال نومبر میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا تھا لیکن انتخابات نہ کرائے جا سکے۔ اس کی ذمہ دار حکومت نہیں ہے۔ انتخابات ملتوی کرانے کے جو لوگ ذمہ دار ہیں۔ لوگ ان سے بخوبی واقف ہیں۔ صدر نے کہا کہ انتخابات انشاء اللہ ضرور ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے الیکشن کمیشن کی تشکیل نو کی جا رہی ہے۔ نئے الیکشن کمشنر مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

۸۔ امنِ عامہ میں خلل اندازی

کچھ عناصر امن و امان میں خلل ڈالنے کے لئے سرگرمِ عمل ہیں۔ حکومت ان کے عزائم سے پوری طرح باخبر ہے۔ جو عناصر غیر ملکی طاقتوں سے ساز باز کر رہے ہیں۔ انہیں جلد عوام کے سامنے بے نقاب کیا جائے گا۔

آج امن و امان کی حالت یہ ہے کہ کسی کی پگڑی نہیں اچھالی جاتی۔ کسی کو دلائی کیمپ میں نہیں بھیجا جاتا۔ پُرسکون فضا میں ملک ترقی کی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ لیکن بعض عناصر امن و امان میں خلل ڈالنے کے لئے سرگرم ہیں۔ بعض عناصر اندرونِ ملک دوسروں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں بعض ملک کے خلاف دوسری طاقتوں سے ساز باز کرنے میں مصروف ہیں۔ حکومت ایسے غیر ملکی ایجنٹوں کے عزائم سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور انہیں جلد ہی عوام کے سامنے لایا جائے گا۔ حکومت کو اس ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس ہے۔

حکومت ہر قیمت پہ ملک میں پُرسکون حالات برقرار رکھے گی تاکہ ملک ترقی کی طرف گامزن رہ سکے۔

۹۔ ایران کا انقلاب

ایران ہمارا ہمسایہ اور برادر اسلامی ملک ہے جس کے ساتھ ہمارے دیرینہ، تاریخی، ذہنی اور ثقافتی تعلقات ہیں، وہاں حضرت امام خمینی کی ولولہ انگیز اور بصیرت افروز قیادت میں اسلامی طرزِ حیات قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم اسے قدر اور تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہمارے ایرانی بھائی اپنے عظیم رہنما کی قیادت میں اپنی جدوجہد کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہوں گے۔

۱۰۔ جائزہ

ہمیں جائزہ لینا چاہیئے کہ

- ہمارے پڑوس میں کوئی بھوکا تو نہیں سویا
- کوئی اپاہج یا معذور تو نہیں جسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔
- ہم نے جھوٹ تو نہیں بولا۔
- ہم نے رشوت تو قبول نہیں کی۔
- امانت میں خیانت تو نہیں کی۔
- دنیاوی خداؤں کی بے جا تعریف تو نہیں کی۔
- بڑوں کی عزت کرتے ہیں۔
- چھوٹوں سے شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔
- اپنے فرائض ایمانداری سے انجام دیتے ہیں۔
- ہمیں روزمرہ زندگی میں اسلامی شعائر کو اپنانا چاہیئے کیونکہ قطرے سے دریا بنتا ہے۔

مطالب الفرقان

جلد سوم

مفکرِ قرآن جناب **پرویز** نے اپنی زندگی قرآن کریم کی فکر اور تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے لغات القرآن شائع کی۔ پھر اس کی روشنی میں پورے کے پورے قرآن مجید کا مفہوم، مفہوم القرآن کے نام سے شائع کیا۔ پھر تین ضخیم جلدوں میں قرآنی انسائیکلو پیڈیا (تبویب القرآن) مرتب کیا۔ اور اس کے بعد اس تمام تحقیق کی روشنی میں قرآن مجید کی مسلسل تفسیر کا سلسلہ مطالب الفرقان کے نام سے شروع کیا۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی اور مشتمل تھی سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی ابتدائی ۲۹ آیات پر۔ دوسری جلد جو سورۃ بقرہ کی آیات ۳۰ تا ۱۴۲ پر مشتمل تھی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس سلسلہ کی تیسری جلد شائع ہوئی ہے جس میں سورۃ بقرہ اختتام پذیر ہو گئی ہے۔ کتاب میں قرآنی تعلیم و حقائق کے کون کون سے موضوعات آ گئے ہیں اس کا اندازہ تو اس کے مطالعہ ہی سے لگ سکے گا۔ ذیل میں اس کے ابواب کے عنوانات دیئے جاتے ہیں:

(۱) الدین کے بنیادی اصول (۲) معمارِ حرم (۳) مرکزِ ملت (کعبہ)۔ (۴) زندگی و حیات۔ (۵) بینات اور کتاب (۶) آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔ (۷) دستورِ خانہ (عائلی زندگی)۔ اور (۸) قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل

آخر میں تینوں جلدوں کے مضامین کا ایک جامع انڈکس دیا گیا ہے۔ کہنے کو تو یہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کے مضامین کا انڈکس ہے لیکن اس میں اسلام کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔

کتاب ولائتی سفید کاغذ پر آفسٹ کی اعلیٰ درجہ چھپائی میں چھپی ہے۔ ضخامت (پہلی جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ یعنی) ۵۲۰ صفحات۔ جلد مضبوط بھی اور دلکش بھی۔ قیمت ۷۵/- روپے فی جلد۔ خرچ ڈاک ۵/- روپے

کتاب ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور

مفسدین کا انجام

پرویز

مکافاتِ عمل کے موضوع پر محترم پرویز صاحب کے سلسلۂ مضامین کی پہلی کڑی ——— ظالم پنپ نہیں سکتا ——— طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مئی سنہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی ——— زیرِ نظر مقالہ اس کی دوسری کڑی ہے۔ جس میں واضح کیا گیا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے فساد کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس وقت جبکہ ساری دنیا کی کیفیت وہ ہو چکی ہے جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ......

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ... (۳۰/۴۱)

"لوگوں کے خود ساختہ نظام و اعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ کرۂ ارض پر ہر جگہ فساد ہی فساد نظر آ رہا ہے۔" ان تنذیراتِ قرآنی کا بار بار سامنے لانا نہایت ضروری ہے، بالخصوص اپنی قوم کے سامنے جو قرآنِ کریم پر ایمان رکھنے کی مدعی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

———(۰)———

اصلاح اور فساد، قرآنِ کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں اور ایک دوسرے کی ضد۔ ہمارے ہاں، فساد کا لفظ دنگہ فساد یا لڑائی جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور "صلح" کا لفظ "صلح صفائی" کے لئے، اور اصلاح، ریفارم کے معنوں میں۔ لیکن (عربی زبان اور) قرآنِ کریم میں یہ اصطلاحات، ان سے کہیں زیادہ وسیع معانی میں استعمال ہوئی ہیں۔ صلح کے بنیادی معنی ہوتے ہیں "جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہیئے اسے ٹھیک ٹھیک اسی حال میں ہونا۔" چنانچہ معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جانے اور افراد کی صلاحیتوں کے مناسب نشوونما پا لینے کے لئے بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ ان کاموں کو کہتے ہیں جن سے حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو، جن سے معاشرہ کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں اور انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ فساد اس کی ضد ہے جس کے معنی ہیں، بگاڑ پیدا ہونا۔ توازن بگڑنا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ ایک چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ طبیعی اشیاء (PHYSICAL THINGS) کے متعلق یہ معلوم (یا طے) کرنا آسان ہے کہ جس شے کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ معمل (یعنی لیبارٹری) کا ٹسٹ اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ لیکن انسانوں کی اخلاقی اور تمدنی دنیا میں اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں

کوئی مفسد، اس کا اقرار و اعتراف نہیں کرتا کہ وہ فساد پیدا کر رہا ہے۔ اس کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہ مصلح، (اصلاح کرنے والا ہے) چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ (۲/۱۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ (ہم فساد کب برپا کرتے ہیں) ہم تو مصلح ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بدنیتی سے فساد کو اصلاح سے تعبیر نہ کرتا ہو بلکہ نہایت نیک نیتی سے فساد کو اصلاح سمجھ کر اس کے لئے کوشاں ہو۔ لیکن نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی مرتب ہو گا — لہٰذا، اس چیز کو لوگوں کے انفرادی فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے لئے کوئی خارجی معیار (OBJECTIVE STANDARD) ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے، حسبِ معمول، ہماری توجہ خارجی کائنات کے نظم و نسق کی طرف مبذول کرائی ہے اور کہا ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ کارگہ کائنات کس طرح ٹھیک ٹھیک چل رہا ہے۔ اس میں ہر شے ویسی ہی ہوتی ہے جیسی اُسے ہونا چاہیئے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آج بارش کے پانی کے اجزاء کچھ اور ہوں اور کل وہ کچھ اور ہو جائیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جو کے بیج سے گندم پیدا ہو جائے اور گندم کے بیج سے جو — سورج کبھی کہیں سے طلوع ہونا شروع ہو جائے اور کبھی کہیں سے، چاندنی کا رنگ آج کچھ اور ہو اور کل کچھ اور۔ کبھی خزاں میں پھول کھلنے لگ جائیں اور بہار میں مرجھا جائیں — ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ

۱- کائنات میں صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے، کسی اور کا نہیں — اس لئے یکساں حالات میں ہر عمل کا نتیجہ بھی ایک جیسا مرتب ہوتا ہے۔ اسے سائنس کی اصطلاح میں (LAW OF UNIFORMITY OF NATURE) کہتے ہیں — اور

۲- ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ وہ قانون کو اپنی مرضی کے تابع نہیں رکھتی۔

اوّل الذکر کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲)

اگر ارض و سما (کائنات) میں خدا کے علاوہ کوئی اور صاحبِ اقتدار بھی ہوتا، تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔

اور ثانی الذکر کے سلسلہ میں کہا کہ

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ (۲۳/۷۱)

اگر حق (خدا کا قانونِ محکم) لوگوں کی مرضی کے تابع ہو جائے، تو ساری کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔

یعنی فساد (بگاڑ) سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ (۱) قانون ایسا ہو جو کسی کی خواہش، مرضی، آرزو، یا مفاد

کے تابع نہ ہو ـــــ اور

۲۔ ہر ایک اس قانون کا اتباع کرے۔ خارجی کائنات کا نظام اسی پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ اس میں جو قانون کارفرما ہے وہ نہ تو اشیائے کائنات کا اپنا پیدا کردہ ہے اور نہ ہی کسی کی خواہش کے مطابق اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ ہر شے اس قانون کے مطابق چلنے پر مجبور ہے ـــــ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔ (۲۱/۱۹)

جہاں تک انسانوں کی تمدنی دنیا کا تعلق ہے، اس کے لئے بھی اُسی خدا نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جس نے اشیائے کائنات کے لئے قوانین مرتب کئے ہیں۔ لیکن انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں ایک بنیادی فرق ہے (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اشیائے کائنات، متعلقہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہیں، لیکن انسان کو اس باب میں صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ مشیت چاہتی یہ ہے کہ جو کچھ اشیائے کائنات مجبوراً کرتی ہیں، انسان وہی کچھ (یعنی قوانینِ خداوندی کا اتباع) اپنے اختیار و ارادے سے کرے، کہ اسی سے اس کی ذات کی نشوونما اور شرفِ انسانیت کی بالیدگی ہوتی ہے۔

لیکن انسان اپنے اختیار و ارادے کا استعمال غلط کرتا ہے اور اسی سے وہ فساد پیدا ہوتا ہے جو اس کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ یہ اپنے لئے آپ قوانین وضع کرتا ہے اور پھر تماشا یہ کہ ان قوانین کا بھی کماحقہٗ اتباع نہیں کرتا۔ ان سے بچنے کے لئے گریز کی ہزار راہیں نکالتا اور لاکھ حیلے تراشتا ہے ـــــ انسان کی یہی وہ ذہنیت (اور روش) ہے، جسے قرآن کریم نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بایں حسن و خوبی بیان کیا ہے۔ ملائکہ اس جدید مخلوق کے ہیولائے آب و گل کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰) اسے بااختیار بنایا جا رہا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا ـــ کہا کہ ٹھیک ہے۔ اگر اسے علی حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو یہ ایسا ہی کرے گا۔ لیکن ہم اسے خود قوانینِ زندگی دیں گے۔ (فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى) یہ اگر ان قوانین کا اتباع کرے گا تو پھر یہ حالت نہیں ہوگی ـــ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) جو ان قوانین کا اتباع کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ خوف ہوگا نہ حزن، ان کی تمدنی زندگی فساد انگیزیوں سے مامون اور خون ریزیوں سے مصئون رہے گی۔ اس کا نام اصلاح ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد ـــــ اسی لئے تاکید کی گئی کہ ـــــ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ـــ جب تمہاری تمدنی زندگی بہ حالتِ اصلاح ہو تو اس میں فساد مت پیدا کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ

وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا۔ (۷/۵۶)

دفعِ مضرت مقصود ہو، یا جلبِ منفعت (کسی کے نقصان سے بچنا چاہو، یا کوئی فائدہ حاصل کرنا ـــ دونوں صورتوں میں) قانونِ خداوندی کو آواز دیا کرو، اور اس کے مطابق قدم اٹھایا کرو۔ تمہاری زندگی فساد سے محفوظ ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اگر تم نے اس اصولِ حیات سے انکار کیا اور اس سے سرکشی برتی ـــ خود بھی سرکشی برتی اور دوسروں کو بھی اس راستے پر چلنے سے روکا، تو اس سے اس قسم کا فساد پیدا ہو

جائے گا جس کی تباہیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ (۱۶/۸۸)

—(۰)—

ان اصولی ہدایات کے بعد قرآنِ کریم نے محسوس انداز میں بتایا کہ انسانوں کی تمدنی زندگی میں فساد کس کس شکل میں رونما ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس نے فسادِ ملوکیت کو نمایاں طور پر پیش کیا جس کی نمائندگی دنیا کا ہر فرعون کرتا ہے۔ ملوکیت سے مراد ہے ایسا نظامِ مملکت جس میں انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کی جائے۔ (خواہ اس کی عملی شکل — جلالِ پادشاہی ہو، یا جمہوری تماشا)۔ مفادِ ملوکیت کا پہلا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسانی وحدت کو ختم کر کے انہیں مختلف گروہوں میں بانٹ دیا جائے — وَيَقْطَعُونَ مَآ أَمَرَ اللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِى الْأَرْضِ (۱۳/۲۵) جس انسانی برادری کو ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اس طرح زمین میں فساد برپا کر دیتے ہیں — اس کی بدترین شکل، عصرِ حاضر کی قومیت پرستی (نیشنلزم) ہے جس نے (محض نقشوں پر کھینچی ہوئی فرضی اور غیر فطری لکیروں کے مطابق) عالمگیر انسانیت کو اس طرح مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے کہ ایک گروہ، دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا، اور ایک قوم دوسری قوم کی جان کی دشمن بن رہی ہے۔ اس سے اگلا قدم، ایک قوم کے اندر مختلف پارٹیاں بنانا ہے۔ قرآنِ کریم نے فرعون کے خلاف جو سب سے بڑا جرم عائد کیا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ قوم (بنی اسرائیل) کو پارٹیوں میں تقسیم کر رہا تھا — إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْأَرْضِ — فرعون نے ملک میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس نے اُدھم مچا رکھا تھا۔ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا۔ یعنی اس نے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا — اس پارٹی بازی سے اُس کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ — يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ — وہ اس طرح اس گروہ کو جسے سے اسے ذرا خطرہ محسوس ہوتا تھا، کمزور کر دیتا تھا۔ اس کی عملی شکل یہ تھی کہ — يُذَبِّحُ أَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْىِۦ نِسَآءَهُمْ۔ اس پارٹی کے ان افراد کو جن میں جوہرِ مردانگی کی نمود ہوتی، ذلیل و خوار کر دیتا اور "زنخوں" کو آگے بڑھاتا چلا جاتا — إِنَّهُۥ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (۲۸/۴) — یہ تھی اس کی فساد انگیزی جس سے اس نے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا کر رکھی تھیں۔

اور یہ چیز کسی خاص فرعونی حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، یہ ملوکانہ حکمتِ عملی ہے، جو ہر زمانے میں اسی طرح کارفرما رہتی ہے۔ چنانچہ سورۂ نمل میں، اس حقیقت کو (ملکہ سبا کی زبانی) ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوٓا أَعِزَّةَ أَهْلِهَآ أَذِلَّةً ۖ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ (۲۷/۳۴)

یاد رکھو! جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اسے اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ یعنی

ط — آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ إِنَّ الْمُلُوكَ ... سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری! (اقبالؔ)

وہاں کے صاحبِ عزت اکابرین کو سب سے زیادہ ذلیل و خوار بنا دیتے ہیں اور یہ بات کسی خاص بادشاہ سے متعلق نہیں، ملوکیت میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

ملوکیت کے وجود اور بقا کا راز ہی اس میں ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹی رہے، اور اس میں ایسا اتار چڑھاؤ ہوتا رہے کہ کبھی ایک گروہ اوپر آجائے اور کبھی دوسرا ——— اور اس عملِ دولابی میں نکتہ یہ پیشِ نظر رہے کہ جس فرد یا گروہ میں کہیں جوہرِ انسانیت کے آثار محسوس ہوں، اسے کچل کر رکھ دیا جائے اور اپنے گروہ پیش انہیں رکھا جائے جن میں ابھرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ یہ تھی فسادِ آدمیت کی وہ اوّلین لعنت جسے مٹانے کے لئے آسمانی انقلاب کے داعی (حضرات انبیاء کرام ؑ) دنیا میں آتے رہے ——— اور یہی تھی ان کی وہ انقلابی دعوت، جسے ملوکیت کے علمبردار "فساد" سے تعبیر کر کے، کچل دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰ ؑ نے اس حکمتِ فرعونی کے خلاف آواز بلند کی تو فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا کہ

أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ (۷/۱۲۷)

کیا تو موسیٰ ؑ اور اس کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دینا چاہتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ملوکیت کے نمائندگان کے نزدیک "اصلاح" کا تصور کیا ہوتا ہے اور "فساد" سے مراد کیا؛ ہر مستند قوت، معاشرہ میں صحیح اصلاح کو فساد سے تعبیر کر کے، اس کے داعیان کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ یہ اربابِ اقتدار کا گروہ ہوتا ہے، جسے اس قسم کے صحیح انقلاب میں، اپنی مفاد پرستیوں کی موت نظر آتی ہے ——— قرآنِ کریم میں ہے کہ جب حضرت صالح ؑ نے، قوم ثمود کی فساد انگیزیوں کے خلاف، (جن کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی) اعلانِ احتجاج کیا تو اس قوم کے اربابِ اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۷/۴۸)

دارالسلطنت میں صرف نو بڑے بڑے سردار تھے، جن کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار تھی۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف نہیں آنے دیتے تھے۔

چنانچہ

انہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور آپس میں کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالح ؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے اور پھر ان کے وارثوں کے سامنے صاف مکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں قتل ہوتے دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ (۲۷/۴۹)

——— (۰) ———

یہ تھی فسادِ آدمیت کی پہلی شکل ——— یعنی بساطِ ملوکیت کی مہرہ بازیاں ——— اس کی دوسری شکل معاشی ناہمواریاں ہیں جن کا ذکر قرآنِ کریم نے بڑی شرح و بسط سے کیا ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے (تمثیلی انداز)

ہیں، اس "جنت کی زندگی" کے متعلق، جس میں ہنوز فساد پیدا نہیں ہوا تھا، کہا کہ اس میں کیفیت یہ تھی کہ

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵)

ہر ایک کو، ہر جگہ، سیر ہو کر کھانے کو ملتا تھا ـــــ اس میں کسی فرد کو، نہ بھوک کا خوف ستاتا تھا، نہ پیاس کا ـــــ نہ لباس کی محتاجی تھی نہ مکان کی (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)

یہ تھی معاشرہ کی وہ حالت جسے فساد نے نہیں چھوا تھا۔ اس کے بعد، حقیقت فراموش انسان کی مفاد پرستی نے اس میں فساد پیدا کر دیا تو معاشرہ کی یہ حالت باقی نہ رہی۔ مصلحینِ انسانیت، حضرات انبیاء کرامؑ آتے رہے، تاکہ معاشرہ کو پھر سے انہی خطوط پر تشکیل کریں۔ وہ قوم سے کہتے یہ کہ

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ۔ (۲/۶۰)

خدا نے جس قدر سامانِ زیست عطا کیا ہے، اس میں سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کھاؤ پیو۔ اور زمین میں فساد مت برپا کرو ـــــ معاشرہ میں ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔

قرآنِ کریم نے جن اقوام کی سرگذشت بیان کی ہے، ان میں سے، قوم ثمودؑ نے اسی قسم کی معاشی ناہمواریاں شدید طور پر پیدا کر لی تھیں۔ اس زمانے کی معیشت، گلہ بانی پر مبنی تھی۔ قوم کے ذی قوت طبقہ نے، ملک کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ کر رکھا تھا کہ کمزوروں اور غریبوں کے مویشیوں کو نہ کھانے کو چارہ ملتا تھا، نہ پینے کو پانی ـــــ حضرت صالحؑ اس "فساد" میں "اصلاح" پیدا کرنے کے لئے اٹھے۔ انہوں نے ان مستبد سرداروں سے کہا کہ ـــــ فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (۷/۷۴) ـــــ خدا نے تمہیں جن نعماء سے نوازا ہے، انہیں پیشِ نظر رکھو، اور ملک میں فساد برپا نہ کرو۔ معاشی ہمواریاں پیدا کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام مویشیوں کی باری باندھ لو ـــــ خواہ وہ غریبوں کے مویشی ہوں۔ اور خواہ امیروں کے، رزق کی ضرورت تو ہر مویشی کو ہوتی ہے۔ ان کی ضروریات کو پورا ہونے دو۔

قومِ مدین کا معاشی نظام، کاروباری تھا، اور انہوں نے اس میں بھی فساد پیدا کر رکھا تھا۔ اس فساد کی تشریح، حضرت شعیبؑ کے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے قوم سے کہا کہ

فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا۔ (۷/۸۵)

(تمہیں چاہیئے، کہ اپنے معاشی نظام میں عدل سے کام لو) ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی مت کرو، اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد، ناہمواریاں مت پیدا کرو۔

قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر، قومِ مدین کی اس فساد انگیزی کا ذکر کیا ہے اور ہر مقام پر اسے انہی الفاظ میں تعبیر کیا ہے (مثلاً ۱۱/۸۵ ؛ ۲۶/۱۸۳-۱۸۱) ـــــ "ماپ تول پورا رکھنے" سے مراد اتنا ہی نہیں کہ ترازو اور باٹ صحیح صحیح رکھو۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ اپنے معاشی نظام کو عدل کی بنیادوں پر استوار کرو۔

معاشی فساد کی بنیاد سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ قرآن کریم نے قارون کو اس ذہنیت کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ قصص میں اس کی "فساد انگیزی" کی تفصیل ان الفاظ میں آئی ہے:۔

قارون، قوم موسیٰؑ ہی کا ایک فرد تھا، کوئی غیر نہیں۔ لیکن اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنی قوم کے افراد سے بڑی زیادتی کرتا تھا۔ چنانچہ اس طرح اس کے پاس اس قدر دولت جمع ہو گئی کہ اس کے خزانے کی حفاظت کے لئے ایک طاقتور جماعت کی ضرورت تھی۔ اس دولت کے نشہ نے اُسے مدہوش کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کی قوم کے ہوش مند طبقہ نے اس سے کہا کہ تم اس مال و دولت پر اس قدر اترائو نہیں، اس کا نتیجہ خراب ہوگا۔ یہ روش قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم مال و دولت کو تیاگ کر تارک الدنیا بن جاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ تم اس سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش مت کرو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہوتا ہے اور بس۔ زندگی اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ اس مال و دولت سے تم اُس زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو حسین بنا دیا ہے، اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ان کی زندگی کو بھی حسین بنا دو۔ اور معاشرہ میں فساد (ناہمواریاں) مت پیدا کرو (کہ تم امیر سے امیر تر ہوتے جاؤ، اور دوسرے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے جائیں۔ اسی کو فساد کہتے ہیں) اور فساد پیدا کرنے والوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا۔

یہ سُن کر اس نے ان سے کہا کہ تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابکدستی سے کمائی ہے، اس لئے اسے جس طرح میرا جی چاہے، صرف کروں۔ اس میں خدا کا کیا دخل ہے اور کسی کو مجھ سے باز پُرس کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

اے کاش! اُسے معلوم ہوتا کہ اس قسم کی ذہنیت نے اس سے پہلے کتنی قوموں کو تباہ کر دیا تھا جو اس سے زیادہ قوت و حشمت کی مالک تھیں، اور انہوں نے مال و دولت بھی اس سے کہیں جمع کر رکھا تھا۔ خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں تباہ کر دیا۔ ان کے یہ جرائم اس قدر بدیہی اور نمایاں تھے کہ اس کی بھی ضرورت نہ پڑی کہ ان کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کی جائے۔ (نظامِ سرمایہ داری کی تو بنیاد ہی خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی تباہی کہیں خارج سے نہیں آیا کرتی۔) (مفہوم القرآن ۲۸/۷۶)

اور فساد کا یہی تباہ کن انجام ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے ـــــ کہیں عمومی حیثیت سے اور کہیں فساد انگیز قوموں کی تباہی کا خصوصی ذکر کر کے ـــــ عمومی طور پر کہا کہ

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ـــــ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ۔ (۱۶/۸۸)

جو لوگ اس صداقت سے خود بھی انکار کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس طرف آنے نہیں دیتے، ان کی تباہیاں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اس فساد کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ جسے وہ معاشرہ میں برپا کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں، اس روش کے حاملین کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ ـــــ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲/۱۲)

ان لوگوں کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ سورۂ یونس میں کہا کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ (۱۰/۸۱)

یہ یقینی بات ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، ایسا ہو نہیں سکتا کہ معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کے کام سنور جائیں۔ یعنی معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے اور جو لوگ اس بگاڑ کے ذمہ دار ہوں، ان کی حالت سنورتی جائے، یہ ناممکن ہے۔ حالت انہی کی سنورے گی جو معاشرہ کو سنوارنے کی کوشش کریں گے۔

سورۂ ص میں ہے۔

اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ .... (۳۸/۲۸)

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں۔ اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کریں، وہ اور وہ لوگ جو معاشرہ میں فساد پیدا کریں، دونوں برابر ہو جائیں۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔

اس اصولِ محکم کی تبیین کے لئے اس نے کہا کہ تاریخ کے اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ جن اقوام نے اس قسم کی روش اختیار کی تھی، ان کا انجام کیا ہوا؟ —— وَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ۔ (۷/۸۶) عاد اور ثمود اور فرعون (وغیرہ) نے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کیں —— فَصَبَّ عَلَیۡہِمۡ رَبُّکَ سَوۡطَ عَذَابٍ۔ (۸۹/۱۳) تو خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں بُری طرح سے تباہ کر دیا۔

یہ تباہی اس وقت آتی ہے جب معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کی روش عام ہو جائے اور جو لوگ اس پوزیشن میں ہوں کہ اس غلط روش کا سدِّباب کر سکیں وہ بھی لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ اقوامِ سابقہ کی سرگذشت بیان کرنے کے بعد، قرآنِ کریم نے کہا کہ ان اقوام میں سے

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے تھے، ان میں سے بھی بعد میں، معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو خدا کے قانون کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ملک میں لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے، ورنہ باقیوں کا حال تو یہ ہو جاتا کہ وہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت کر اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے، تاکہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے (خواہ باقی مخلوق پر کچھ ہی کیوں نہ گذرے)۔ یہ تھے ان کے جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آتی تھی۔

(مفہوم القرآن - ۱۱/۱۱۶)

—— (۰) ——

آپ قرآنِ کریم کے ان مقامات پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ اس نے فسادِ آدمیت کی جو جو شقیں بتائی ہیں، کیا وہ ہمارے معاشرے میں جمع نہیں ہو رہیں؟ اور اگر یہ حقیقت ہے تو کیا اس انداز معاشرت کا حتمی اور یقینی

نتیجہ وہی نہیں ہوگا جو اقوامِ سابقہ کے ہاں ہوا تھا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری حالت اس وقت بعینہٖ ویسی ہی ہو چکی ہے جیسی قوم مدین کی تھی۔ اس قوم کے متعلق جو کچھ قرآن کریم نے کہا ہے وہ ہر قلبِ حساس کے لئے سامان صد ہزار عبرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ سورہ ہود میں ہے۔

اور اسی طرح ہم نے قوم مدین کی طرف، ان کے بھائی بند، شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم اپنے آئین و رسوم کو چھوڑ کر صرف خدا کے قوانین کی اطاعت اختیار کر لو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے خوشحال ہو لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس حالت کو بدلو۔ اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آجائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں (فساد) پیدا ہو جائیں گی اور معاشرہ تہس نہس ہو جائے گا۔

یاد رکھو! جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے اکٹھا کر لیتے ہو، اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ ثبات و دوام صرف ان مفادات کے لئے ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں ——— اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اُسے حاصل ہو سکتا ہے، جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اس وقت آسکتی ہے جب تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو۔ اگر تم اسے تسلیم نہیں کرتے، تو تم سے اسے جبراً نہیں منوایا جا سکتا۔ میرا کام تم تک اس پیغام کو پہنچا دینا تھا۔ میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا جو تم سے جبراً یہ کچھ منواؤں۔ (مفہوم القرآن۔ ۱۱/ ۸۴ - ۸۶)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک قوم، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں لاتی ——— یعنی اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرتی۔ اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آسکتی ——— اور جب تک یہ اپنی موجودہ روش میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی، یہ تباہی سے بچ نہیں سکتی۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔

اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

——— (۰) ———

ریکارڈ میں رکھیئے

۱۔ پھر اسلام، قرآن اور ایمان کی کیا ضرورت ہے؟

کراچی کے روزنامہ جنگ کی ۱۷ مئی ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں "قادرِ مطلق کے حضور" کے جلی الفاظ اور "ادارۂ تجرباتِ روحانی" کی خفی سرخی کے ساتھ محترم رئیس امروہوی کے قلم سے حسبِ ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

"شکوک و شبہات کے بادل چھٹ رہے ہیں اور ایک مرتبہ پھر امید و یقین کی کرنیں جھلملانے لگی ہیں۔ آج سے نصف صدی پیشتر یورپ کے سائنس دانوں اور مفکروں نے اعلان کیا تھا کہ ہم تحقیق کر چکے ہیں۔ خدا کا کوئی وجود نہیں اور قادرِ مطلق کا تصور انسانی ذہن کی اختراع ہے۔ لیکن اب پھر سائنسی بنیادوں پر عرفانِ حقیقت (خدا کی پہچان) کی کوشش شروع کی گئی ہے۔ اس تحریک کی ابتدا ۱۹۶۹ء میں ہوئی تھی اور پچھلے گیارہ سال میں۔ صداقت کی تلاش اور حقیقت کے عرفان کی سمت میں نمایاں پیش قدمی ہوئی ہے۔ بہت سے لوگوں کو اپنی زندگی کے کسی نازک ترین لمحے پر ایک برتر قوت کی راہ نمائی کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی قادرِ مطلق کسی ابدی، سرمدی۔ جاودانی اور غیر فانی ذات کی گرفت میں ہیں۔ یہ احساس اس قدر شدید اور اتنا یقینی ہوتا ہے کہ آدمی کی پوری زندگی کا نہج اور اس کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ ان ذاتی روحانی تجربات کا اب سائنسی مطالعہ کیا جا رہا ہے اس تحریک کے رہنما ہیں مشہور زیالوجسٹ سر السٹر ہارڈے، جنہوں نے مانچسٹر کالج آف آکسفورڈ میں "ادارۂ تجرباتِ روحانی" (THE RELIGIOUS EXPERIENCE UNIT) قائم کیا ہے۔ انسانی زندگی میں اس وقت تک گہرے معانی اور عظیم الشان مقاصد کی روشنی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ہم ایک اعلیٰ ترین ذات سے جو خالقِ کل قادرِ کل اور عادلِ کل ہے اپنے کو وابستہ نہ کر لیں! بیشتر لوگ اپنی عام زندگی قادرِ مطلق کے تصور کے بغیر بسر کرتے ہیں اور وہ کائنات کو ویسا ہی سمجھ لیتے ہیں جیسے وہ نظر آتی ہے۔ لیکن اس بے یقینی، حقیقت ناشناسی اور خدا فراموشی کے اندھیرے میں کبھی کبھی اک بجلی چمکتی ہے اور پورا ماحول جگمگانے لگتا ہے۔ یہ حیاتِ انسانی کا بڑا قیمتی اور ناقابلِ فراموش لمحہ ہوتا ہے جو انسان کی یکسر قلبِ ماہیت کر دیتا ہے سر السٹر ہارڈے اور ان کے رفقاء نے لوگوں کے اسی قسم کے تجربات (جنہیں محسوس ہوا کہ ہم خدا کے سامنے حاضر ہیں) کو جمع کیا ہے اور اب وہ ان کا علمی اصول پر کسی مذہبی شغف یا دینی رجحان کے بغیر مطالعہ کر رہے ہیں۔ حال ہی میں سر السٹر ہارڈے نے ان روحانی تجربات کے بارے میں اپنی رپورٹ شائع کی ہے "دی اسپریچول نیچر آف مین" (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) یعنی انسان کی روحانی جبلت! یہ رپورٹ چار ہزار افراد کے تجربات پر مشتمل ہے۔ ان کا بیان ہے کہ یکایک پردہ اٹھ گیا اور ہم پر ذاتِ مطلق کی تجلی وارد ہوئی یعنی براہِ راست خدا سے ربط پیدا ہو گیا۔ بندے اور خدا کے درمیان یہ ربط ایسا

ہے جسے نہ سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ نہ عمل کے ذریعے اس کی حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے۔ بس یہ ایک اٹل مغلوب کر دینے والا۔ چھا جانے والا تصور ہے۔ جس کی لذّت کو صرف روح ہی سمجھ سکتی ہے۔ الفاظ اس کیفیت کی وضاحت سے قاصر ہیں۔ روزنامہ ڈان کے کالم نویس یحییٰ ایم سیّد نے سر السٹر ہارڈی کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان مضامین کی طرف اشارہ کیا ہے جو میں روزنامہ جنگ میں لکھتا رہا ہوں۔ یحییٰ ایم سیّد لکھتے ہیں کہ اس رپورٹ کو پڑھتے ہوئے میرا ذہن ان مضامین کی طرف منتقل ہو گیا جو کراچی کے ایک اُردو روزنامے میں چھپتے رہے ہیں۔ جن میں بہت سے پاکستانیوں کے بیانات نقل کئے گئے تھے کہ ایک شدید بحران کے موقع پر جب ہم شدت کے ساتھ روحانی رہنمائی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ ہمیں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی (خواب میں بھی بیداری میں بھی) اور ہم اس جذباتی بحران پر غالب آ گئے۔ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب (ورائٹیز آف ری لیجس ایکسپیرئینس) ولیم جیمس نے لکھی تھی۔ جس کا شمار اب کلاسیکس میں ہوتا ہے۔ یہ روحانی تجربہ صرف خوش عقیدہ لوگوں ہی کو نہیں بعض ملحدوں کو بھی ہوتا ہے۔ روزمرہ بسر کی جاتی ...... والی زندگی میں انسان کی پوری توجہ اپنے معمولاتِ حیات کی طرف مرکوز رہتی ہے۔ کھانا پینا۔ سونا۔ جاگنا۔ چلنا پھرنا۔ اور اگر آدمی مذہبی واقع ہے تو اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرنا۔ مگر یہ سب مشینی عمل ہوتا ہے۔ اس میں کوئی گہرائی۔ کوئی تڑپ اور کوئی اضطراب نہیں ہوتا۔ بس ایک عادت ہے جس کی تکمیل ہو رہی ہے۔ لیکن جب انسان کسی جذباتی بحران سے دوچار ہوتا ہے مثلاً محبوب ترین اعزا کی موت۔ شدید جذبہ عشق۔ کسی مہیب خطرے کا مقابلہ۔ وغیرہ وغیرہ تو ایسے مواقع پر انسانی روح کے ساکت سمندر میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ اور بیشتر روحانی مشاہدے۔ کسی غیبی طاقت کی معجز نمائی کے کرشمے کسی نادیدہ وجود کا احساس یا یہ احساس کہ میں بجائے خود کائنات ہوں اور سارے کون و مکاں اور زمین و زماں میرے دل کے اندر دھڑک رہے ہیں۔ الغرض اسی نوعیت کے تجربات آنِ واحد میں ہو جاتے ہیں اور انسان کو بیک نظر ان تمام رموز و اسرار کی جھلک نظر آ جاتی ہے جنہیں سمجھنے سے عقل قاصر ہے! سر السٹر نے اس سلسلے میں کچھ مشقیں بھی تجویز کی ہیں۔ جن کا تذکرہ انشاء اللہ آئندہ مجلس میں کیا جائے گا۔"

(چرس پینے والوں کا دعوےٰ ہے کہ چلم کا ایک کش لگانے سے بھی یہی کچھ نظر آنے لگ جاتا ہے! طلوعِ اسلام)

۲۔ اسلامی نظریاتی کونسل

روزنامہ جنگ کی ۱۷ مئی ہی کی اشاعت میں حسبِ ذیل افتتاحیہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "بے مقصد"۔

"اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مولانا مفتی محمد حسین نعیمی نے کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دیا ہے۔ انہوں نے آج ملاقات میں بتایا کہ میں نے اس سلسلہ میں ایک خط صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کو بھی بھیجا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل یہ کہہ کر قائم کی گئی تھی کہ اس کی سفارشات کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ لیکن پورے تین سال کے عرصہ میں اس کی کسی بھی سفارش پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ ان حالات میں میرا کونسل میں شامل رہنا بے مقصد ہے۔

اس لئے ۹ مئی سے کونسل سے علیحدگی اختیار کر رہا ہوں۔

سرکاری سطح پر اسلامی کونسلوں کی تشکیل کا سلسلہ قیام پاکستان کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیاقت علی خاں مرحوم کے زمانے میں "اسلامی دستور کی کمیٹی" بٹھائی گئی۔ اور اس کے ساتھ ایک "اسلامی تعلیماتی بورڈ" مقرر کیا گیا۔ پھر ایک زکوٰۃ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ایوب خان صاحب کے زمانے میں "اسلامی تحقیقاتی ادارہ" قائم کیا گیا۔ اور "اسلامی مشاورتی کونسل" تشکیل دی گئی، ۱۹۷۳ء میں بھی اسی قسم کی ایک کونسل وجود میں آئی اسی تسلسل میں موجودہ "اسلامی نظریاتی کونسل" قائم ہوئی۔ اور اس کا اعلان کرتے ہوئے یہ خوشخبری دی گئی تھی کہ اس کے فیصلوں پر پوری مستعدی سے عمل درآمد ہوگا، ان کونسلوں پر کروڑوں روپے کے مصارف اٹھے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کونسلوں کی کارکردگی کبھی اطمینان بخش نہ ہوئی نہ ان کے ذریعہ ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کی کوئی سبیل نکل سکی۔

موجودہ "اسلامی نظریاتی کونسل" کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بعض اچھے فیصلے بھی کئے اور اس سلسلے میں خاصی محنت و جانفشانی سے کام لیا۔ مگر اب تک اس کے کسی فیصلے کو خوش آمدید نہیں کہا گیا، نہ اسے شرف پذیرائی بخشا گیا۔ اس لئے مولانا نعیمی صاحب کا یہ احساس غلط نہیں کہ "ان حالات میں میرا کونسل میں شامل رہنا بے مقصد ہے" کونسل میں جو دوسرے علماء کرام شامل ہیں غالباً ان کا احساس بھی یہی ہوگا۔ لیکن شاید انہیں یہ فیصلہ کرنے میں وقت پیش آرہی ہے کہ ان حالات میں کونسل سے مستعفی ہو جانا زیادہ بہتر ہے یا اچھی توقعات کے ساتھ مزید انتظار کرنا چاہیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اگر کونسل کے مطلوبہ نتائج ظاہر نہیں ہو رہے تو صحیح فیصلہ وہی ہے جو مولانا نعیمی نے کیا۔ البتہ یہ امر لائق غور ہے کہ جب اتنی توقعات اور وعدوں کے باوجود اسلامی نظریاتی کونسل اسلامی قانون کے نفاذ میں سود مند ثابت نہیں ہوتی تو اس ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کی کیا صورت ہوگی؟ کیا ہمیں اس نیک اور پاکیزہ مقصد کے حصول سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے۔ یا اس کے لئے کوئی بہتر طریق کار تجویز کیا جا سکتا ہے؟

۳۔ محکمہ اوقاف

اس افتتاحیہ کا اگلا عنوان ہے "محکمہ اوقاف"۔ اس کے تحت لکھا ہے:۔

"محکمہ اوقاف کے بارے میں متعدد بار اخبارات میں خبروں اور ادارتی نوٹوں کے ذریعہ یہ بات واضح کرائی گئی ہے کہ یہ ادارہ مساجد اور درگاہوں کی صحیح دیکھ بھال نہیں کرتا، ائمہ کرام کو اس محکمے کے ذریعہ تنگ کیا جاتا ہے اور اس میں اتنی زیادہ دھاندلی ہے کہ اس کی اصلاح بھی غالباً ممکن نہیں، اس عام تاثر کے برعکس ۱۱ مئی کے اخبارات میں محکمہ اوقاف سے متعلق ائمہ کرام کی یہ اپیل شائع ہوئی ہے جس میں اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ محکمہ نہ ان مساجد اور درگاہوں کی صحیح دیکھ بھال کرتا ہے بلکہ محکمہ نے گزشتہ دنوں ائمہ کرام کو تنگ کرنے کے لئے طرح طرح کے بہانے بنا کر ان کی تنخواہوں میں کمی کر دی ہے ان کی تنخواہیں عام سرکاری دفاتر کے چپراسی اور کلرکوں کے برابر کر دی گئی ہیں یہ بات کتنی افسوسناک ہے کہ ایک ایسا ادارہ جو خالص مذہبی بنیاد پر قائم ہو اور جس کا مقصد صرف اور صرف مساجد اور درگاہوں کا تحفظ ہو اس میں اس قسم کی دھاندلی اور وہ بھی

دیگر تمام دفاتر کے مقابلہ میں زیادہ جب اس ملک میں ایک ادارہ خالص دیانت کی بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتا اور لوگوں کو اس پر اعتماد نہیں تو پھر زکوٰۃ اور عشر اور دیگر اسلامی معاملات جو خالص دیانت پر ہی قائم ہو سکتے ہیں کے بارے میں لوگوں کو کس طرح اعتماد ہو گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ادارہ کی فوراً اصلاح کی جائے اور اگر اصلاح ممکن نہ ہو تو پھر اس سے قوم کی گلو خلاصی کرائی جائے۔ جو لوگ بذاتِ خود ہی اپنے علاقے کی مساجد اور درگاہوں کی حفاظت پہلے کرتے تھے۔ آئندہ بھی اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں"۔

○

۴۔ آنحضرت (صلعم) کے نقشِ قدم پر!

روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی ۱۵ مئی سنہ ۱۹۸۰ء کی اشاعت کے صفحہ اوّل پر محترم عبدالرحمٰن عبد کے قلم سے، عنوانِ بالا کے تحت ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس کے اقتباسات درجِ ذیل ہیں:۔

"عالمِ اسلام میں تقریبات کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں حکومت کی سطح پر اس کے لئے نمایاں شخصیات پر مشتمل کمیٹی ترتیب دی گئی ہے جو سیمینار، علمی اجلاس اور دوسری تقریبات منعقد کرنے کے لئے سرگرمی سے کام کر رہی ہے۔ اس ضمن میں ایک حقیر تجویز یہ ہے کہ عالمِ اسلام سے مختلف لوگوں کی ایک مہم ترتیب دی جائے جو اس سال جولائی میں مکہ معظمہ کے جنوب میں واقع غارِ ثور سے روانہ ہو کر مدینہ منورہ تک جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہجرت کے سفر کو طے کرے ..... سورۃ النمل میں ارشادِ خداوندی ہے کہ دنیا میں گھومو پھرو" سِيرُوا فِي الْأَرْضِ" اور آپ دیکھیں گے دنیا میں جب بھی کوئی قوم آگے بڑھتی ہے وہ اپنے گھر، شہر اور ملک سے نکلتی ہے۔ جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہے وہ نہ تورانی رہتی ہے نہ افغانی نہ ایرانی وہ عالمگیر ہو جاتی ہے جہانگیر و جہاندار و جہاں آراء ہو جاتی ہے اور اپنا پیغام لے کر اقصائے عالم میں پہنچتی ہے۔

یہی جذبہ اس تجویز میں کارفرما ہے کہ نبی کریمؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک مہم غارِ ثور سے مدینہ منورہ تک جانی چاہیئے اور وہ ممکن حد تک اس راستے پر چلے۔ جس پر آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ چلے تھے بہتر ہو کہ یہ مہم اس جولائی میں روانہ ہو کیونکہ آنحضورؐ نے چودہ سو سال پہلے جب ہجرت فرمائی تھی تو مورخین کی تحقیق کے مطابق وہ جولائی کا مہینہ تھا اس طرح موسم کی کیفیت وہی ہو گی۔ غارِ حرا میں یا اس کے پاس تین راتیں گزاری جائیں، اس مہم میں دوسرے مسلمان ممالک کے محققین بھی شامل ہوں تاکہ یہ مہم اسلامی دنیا کی نمائندہ ہو لیکن پاکستان کے محققین، علماء اور ادباء کی تعداد زیادہ ہونی چاہیئے تاکہ اس پر پاک مہم کا رنگ غالب ہو تاکہ اس سے ہمارے ملک کی عزت و توقیر میں اضافہ ہو۔ واضح متعین مقاصد کے ساتھ اس مہم کو عمدہ ترتیب و تنظیم، منصوبہ بندی اور جوش و جذبہ سے بروئے عمل لایا جائے تو اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں"۔

○

۵۔ سکندر مرزا (مرحوم) کی لاش

روزنامہ نوائے وقت مؤرخہ ۴ جون سنہ ۱۹۸۰ء میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

تہران ۳ رجون (ان پ) ایک اطلاع کے مطابق فدایانِ اسلام نے پاکستان کے پہلے صدر میجر جنرل اسکندر مرزا کی نعش قبر سے نکال کر پھینک دی ہے میجر جنرل اسکندر مرزا ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ملک سے باہر چلے گئے تھے اور جب انہوں نے طویل علالت کے بعد لندن میں وفات پائی تو ان کی ایرانی نژاد بیوی ناہید اسکندر مرزا نے سابق صدر یحییٰ خان سے درخواست کی کہ ان کے شوہر کی نعش کو خاموشی کے ساتھ پاکستان لاکر دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔ مگر صدر یحییٰ خان نے یہ درخواست مسترد کر دی جس پر معزول شاہ ایران کے حکم پر ان کی نعش تہران لائی گئی جہاں وہ پورے اعزاز کے ساتھ ایران کے سابق وزیر اعظم فضل اللہ زاہدی کے پہلو میں سپردِ خاک کر دی گئی۔ وزیر اعظم زاہدی ایرانی فوج کے ایک اہم افسر تھے اور جب سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق کے دور میں معزول شاہ ملک سے فرار ہو کر چلے گئے تو زاہدی نے سی آئی اے کی مدد سے ان کی حکومت کا تختہ الٹ کر معزول شاہ کی وطن واپسی کی راہ ہموار کی۔ بعد میں جنرل زاہدی کے فرزند اردشیر زاہدی کی شادی معزول شاہ کی ایک دختر سے کر دی گئی۔ گزشتہ دنوں فدایانِ اسلام نے اسلامی عدالتوں کے سربراہ آیت اللہ خلخالی کے حکم پر زاہدی مرحوم کے مقبرے پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کی عمارت میں اپنا دفتر قائم کر لیا۔ تو زاہدی اور اسکندر مرزا دونوں کی لاشیں قبر سے نکال کر پھینک دی گئیں۔ آیت اللہ خلخالی نے اس خبر کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ مرزا اور زاہدی دونوں اسلام کے دشمن اور سامراج کے ایجنٹ تھے۔

(اس سے پہلے وہاں، معزول شاہ ایران کے والدِ مرحوم کے مقبرہ کو منہدم کر دیا گیا تھا۔ طلوعِ اسلام)

۶۔ داتا گنج بخشؒ کا ماہانہ ختم شریف

روزنامہ مشرق، کی ۴ رجون ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے :-

لاہور ۳ رجون (سٹاف رپورٹر) حضرت علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخشؒ کے مزار پر آج ماہانہ ختم شریف کی تقریبات نہایت عقیدت و احترام سے منعقد ہوئیں ختم شریف نمازِ عصر کے بعد شروع ہوا اور نمازِ عشاء تک جاری رہا۔ اس تقریب میں معروف نعت خوانوں نے حصہ لیا۔ لنگر تقسیم ہوا جس میں بیس ہزار نان ۲۵ دیگیں دال، ایک سو دیگ پلاؤ اور تقریباً دس من مٹھائی شامل تھی۔

(واضح رہے کہ یہ ماہانہ ختم شریف کی روئداد ہے۔ سالانہ عرس کی نہیں۔ طلوعِ اسلام)

۷۔ برمی مہاجرین کا قافلہ

نوائے وقت بابت ۶ رجون ۱۹۸۰ء میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے :-

وال مادھارام۔ ۵ رجون (نامہ نگار) برما سے آنے والے ۱۳ مہاجرین کے لٹے پٹے قافلہ کو ہتو کی پہنچنے پر ملکی حدود

کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے قصور جیل بھیج دیا گیا ہے جن میں ۹ مرد، آٹھ عورتیں ۱۴ بچے جن میں چار شیر خوار بچے بھی شامل ہیں۔ انہیں چونیاں عدالت میں پیش کرنے کے لئے جوڈیشل حوالات میں لایا گیا تو بار ایسوسی ایشن چونیاں کے صدر سردار محبت علی ڈوگر، سردار محمد صدیق ڈوگر، سید سعادت علی نقوی کے علاوہ علاقہ کے بہت سے مردوں اور خواتین نے قافلہ والوں سے ملاقات کی۔ قافلہ کے سربراہ عبدالجبار نے بتایا کہ وہ برما کے گاؤں سندھی پیانگ سے ہندو غنڈوں کے مظالم سے تنگ آ کر پاکستان آئے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ ہندو غنڈوں نے ان کا تمام متاعِ حیات لوٹ لیا ہے، جب کہ ان کے تین آدمیوں کو قتل بھی کر دیا گیا اور دو نوجوان لڑکیوں کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ دو ماہ کے طویل عرصہ میں چھپ چھپا کر لمبی مسافت طے کر کے پاکستان اس لئے پہنچے ہیں کہ یہاں ان کی عزت و آبرو اور جان کی حفاظت ہو سکے، انہوں نے کہا کہ اگر انہیں واپس کر دیا گیا تو ہندو انہیں نہ صرف قتل کر دیں گے بلکہ ان کی عورتیں بے آبرو ہوں گی۔ انہوں نے اسلام کے نام پر اپیل کی کہ انہیں پاکستان میں رہنے دیا جائے۔ تاکہ وہ محنت وغیرہ کر کے اپنا وقت پاس کر سکیں۔

۸۔ ایران میں سزائے موت

انگریزی روزنامہ "دی مسلم" (اسلام آباد) کی ۷ رجون ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:-

ایران کے اسلامی جج، آیت اللہ خلخالی کے حکم کے تحت آج (۶ رجون کو) ان (۱۲) افراد کو مار دی گئی جو منشیات کے جرم میں ماخوذ تھے۔ اس سے (۲۱) مئی سے لے کر، جب سے یہ مہم شروع ہوئی ہے نیز آج تک، ان جرائم کے تحت موت کے گھاٹ اتارے جانے والوں کی تعداد (۶۸) تک پہنچ گئی ہے۔

دِین

اپنی مکمل، عملی شکل میں عہدِ فاروقیؓ میں قائم ہوا۔
اس کے کچھ عرصہ بعد یہ مذہب میں بدل گیا۔
دِین کی وہ شکل کیا تھی اور یہ مذہب میں کیسے تبدیل ہو گیا؟ اس کی تفصیل پرویز صاحب کی مایۂ ناز کتاب

شاہکارِ رسالتؐ

میں ملے گی۔

قیمت مجلد -/۴۵ روپے ——— (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ

(۱) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن فہمی کے اصول

علّامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری علیہ الرحمۃ

پرویز صاحب نے جب اپنی مایۂ ناز تصنیف معارف القرآن کا سلسلہ شروع کیا تو اس کی پہلی جلد (جس کا عنوان اللہ تھا، ۱۹۴۱ء میں (دہلی سے) شائع ہوئی۔ اس جلد کا آغاز حضرت علامہ اسلم جیراجپوری کے ایک جامع اور مبسوط مقدمہ سے ہوا تھا جو بلند پایہ قرآنی حقائق اور بیش بہا معلومات پر مبنی تھا۔ یہ مقدمہ اس جلد کے دوسرے ایڈیشن میں بھی شامل تھا جو وہیں سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد معارف القرآن کی مختلف جلدوں کو موضوع کے اعتبار سے مختلف عنوانات کے تحت شائع کیا گیا چنانچہ جلد اوّل، تیسری بار ۱۹۵۶ء میں "من و یزداں" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس میں علّامہ مرحوم کا مقدمہ اور خود پرویز صاحب کا مفصل تعارف شامل نہیں تھا۔

قارئین طلوعِ اسلام (بلکہ پرویز صاحب کی فکر سے متفق دیگر ارباب علم و دانش) کی طرف سے یہ تقاضا، باصرار و تکرار موصول ہوتا رہتا ہے کہ طلوعِ اسلام کے دورِ قبل یا دورِ جدید کے ابتدائی ایّام میں اس میں جو اہم مقالات شائع ہوئے تھے، انہیں بارِ دیگر شائع کیا جائے تاکہ وہ احباب جن کے پاس طلوعِ اسلام کے مکمل فائل نہیں۔ یا جو اس حلقہ میں بعد میں شریک ہوئے ہیں ان سے مستفید ہو سکیں۔ انہی میں علامہ مرحوم کا مذکورہ بالا مقدمہ بھی شامل ہے۔ طلوعِ اسلام ان حضرات سے متفق ہے اور بشرطِ گنجائش، اس قسم کے سابقہ مقالات شائع کرتا رہتا ہے۔ اشاعتِ حاضرہ میں، علامہ مرحوم کا مقدمہ شائع کیا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ کس قدر بلند پایہ قرآنی حقائق پر مشتمل اور گراں بہا معلومات کا خزانہ ہے، اور اس کی بارِ دیگر اشاعت کس قدر افادۂ عام کا موجب ہوگی۔ فہم قرآن کے سلسلہ میں تو علامہ مرحوم کا ایک ایک لفظ مغتنمات میں سے ہے اور اس قابل کہ اسے محفوظ کر لیا جائے کہ ـــــ بعد از نایدچو او مردِ فقیہہ! (طلوعِ اسلام)

مقدمہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن اتار کر بنی نوع انسان پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ اور اپنے اس دین کو جس کو انسانوں کی آغازِ آفرینش سے ان کی ہدایت کے لئے بنایا تھا اس کتاب کریم میں مکمل کر دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵/۳)

آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کیا۔

قرآن کریم ایسی صاف عربی زبان میں نازل ہوا جس کو عام طور پر اہلِ عرب سمجھتے تھے خود قرآنی آیات میں اس کی زبان "عربی مبین" کہی گئی ہے یعنی کھلی ہوئی اور واضح۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے اپنے کو "نورِ مبین" کہا ہے۔ نیز قرآنی آیات کو بھی آیاتِ بینات" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۲۹/۴۹)

بلکہ وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔

الغرض قرآن کی زبان، قرآن کی تعلیم۔ اور قرآنی آیات کا مفہوم سب خود قرآن کے بیان کے مطابق واضح، کھلا ہوا اور جگمگاتا ہوا نور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بار بار تصریح کی ہے کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴/۱۷)

ہم نے قرآن کو نصیحت لینے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ کوئی ہے جو نصیحت لے۔

نصیحت لینے کی آسانی کو دیکھنے کے لئے خود اہلِ عرب پر نظر ڈالنا کافی ہے جو قرآن کے اولین مخاطب اور بالعموم بدوی اور ناخواندہ تھے جس کی وجہ سے قرآن نے اُن کو "امیین" کا لقب دیا اور فرمایا :-

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (۶۲/۲)

وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول۔

ان اُمیوں نے بے تکلف قرآن کو سمجھا اور اس کے اوپر عمل کیا اور کامیاب ہوئے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں :-

ان القرآن نزل بلغة العرب على اساليب بلاغتهم وكانوا كلهم يفهمونه و يعلمون معانيه في مفرداته وتراكيبه

قرآن عرب کی زبان میں ان کے اندازِ بلاغت کے مطابق نازل ہوا ہر ایک اس کو سمجھتا تھا اور اس کے مفردات و مرکبات کے معانی کا علم رکھتا ہے۔[1]

علامہ موصوف کا مقصد غالباً یہ ہے کہ اہلِ عرب بالعموم قرآن سے اس کی تعلیمات کو سمجھتے تھے۔ ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر فردِ امتِ عربیہ کا اس کے جملہ الفاظ کے معانی اور اس کی تمام تراکیب کی تفصیلات کا عالم نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۳۶۷

وہ ایک سادہ مفہوم اس کا ضرور سمجھ لیتے تھے اور ہر ایک آیت کے تفصیلی معانی تک پہنچنے کی تکلیف لازمی خیال نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ کر لینا کہ وہ بالعموم آیات کے سرسری مفہوم پر قانع تھے صحیح نہیں ہو سکتا۔ ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھتے تھے تو جب تک ان کی علمی اور عملی حقیقت کو جان نہ لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی شخص سورۂ بقرۃ اور آل عمران پڑھ لیتا تھا تو ہماری نگاہوں میں محترم ہو جاتا تھا[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں زیادہ تر آیات محکمات ہیں جو اصولِ دین اور احکامِ شریعت سے تعلق رکھتی ہیں یا انبیاء کرامؑ اور اقوامِ سابقہ کے نتیجہ خیز اور عبرت انگیز قصص ہیں۔ ان کا سمجھنا جمہور کے لئے آسان ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ حقائقِ غامضہ بھی ہیں جن کو صرف راسخون فی العلم ہی سمجھ سکتے ہیں اور صحابہ کرامؓ میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی نگاہوں میں اس کا عملی پہلو غالب تھا۔ یہاں اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ ظاہری اور عملی حیثیت کے علاوہ قرآن کریم کی نظری اور عقلی حیثیت بھی اہم ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب جو آسانی کے ساتھ صرف چند اجزاء میں نمایاں اور صاف لکھی جا سکتی ہے قیامت تک کے لئے امتِ اسلامیہ کا دستور العمل بنائی گئی ہے اور ہر زبان اور ہر مکان میں ان کی ہدایت کا نصاب قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ ایسے حقائقِ جاودانی پر مشتمل نہ ہوتی جن کو ابدالآباد تک انسانی نسلیں ختم نہیں کر سکیں گی، تو کیونکر ان کا دائمی نصابِ ہدایت بننے کی صلاحیت رکھتی؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے صرف عملی نصیحت ہی لینے کی ہدایت نہیں کی گئی۔ بلکہ اس میں تفکر اور تدبر کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے۔ مثلاً

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ (۳۸/۲۹)

مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں۔

دوسری جگہ ہے:-

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴)

کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں۔

ایک اور آیت ہے:-

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ..... (۱۶/۴۴)

اور ہم نے تیری طرف قرآن اتارا تاکہ لوگوں کے لئے جو اتارا گیا ہے اس کو ان کے سامنے بیان کر دے اور تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں۔

الغرض اہلِ نظر کو قرآن نے اپنی آیات میں فکر و نظر کی دعوت دی ہے تاکہ وہ ان سے اپنی ہدایت لیتے اور اپنی فلاح کا راستہ نکالتے رہیں۔ اس کا دعویٰ ہے:-

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۶۸/۵۲)

وہ نہیں ہے مگر سارے عالموں کے لئے نصیحت

---

[1] مسند امام احمد

یعنی جملہ بنی نوعِ انسان کے لئے خواہ وہ کسی عالم، کسی ماحول، کسی زمان اور کسی مکان میں ہوں۔

تاریخ تفسیر

یہی وجہ تھی کہ عہدِ رسالت میں فقہاءِ صحابہؓ اس کی آیات میں تدبر کرتے تھے اور بعض امور کو جو ان کے سامنے فی الجملہ واضح نہیں ہوتے تھے، خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے تھے لیکن بہت کم کیونکہ کثرتِ سوال کی آفتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔

علامہ سیوطی نے اپنی مفید کتاب الاتقان فی علوم القرآن کی آخری فصل میں ان تمام تفسیری روایتوں کو جمع کر دیا ہے جو صحابہؓ کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہیں۔ وہ کل کی کل ان کی کتاب کے بیس صفحوں سے بھی کم ہیں اور تنقیدِ صحیح کے بعد تو بہت ہی تھوڑی رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ بھی زیادہ تر الفاظ کے معانی کے متعلق ہیں۔

مفسرین صحابہؓ

جن صحابہ کرامؓ سے یہ تفسیر کی روایتیں آئی ہیں۔ ان میں سے جو حضرات خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں، وہ خلفاء اربعہ، عبداللہ بن مسعود، اُبیّ بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان میں سے حضرات شیخینؓ سے بوجہ ان کے تقدمِ عہد اور امورِ ملّت میں مشغولیت کے نہایت کم روایتیں ہیں حضرت عثمانؓ اگرچہ قرآن سے اس قدر شغف رکھتے تھے کہ رات کا بڑا حصہ کھڑے ہو کر اس کی تلاوت میں گزارا کرتے بلکہ کبھی کبھی خشوع و خضوع میں جب محویت کا عالم طاری ہو جاتا تو ایک ہی آیت کو بار بار گھنٹوں تک دھراتے رہتے۔ مگر تفسیر کی روایتیں ان سے بھی بہت کم مروی ہیں۔ زیادہ روایتیں حضرت علیؓ سے کی گئی ہیں، جو شوق دلاتے رہتے تھے کہ لوگ قرآن سیکھیں اور سمجھیں اور اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے کہ تم کو کتاب اللہ کی بابت جو کچھ پوچھنا ہے میری زندگی ہی میں مجھ سے پوچھ لیں، کیونکہ میں علم رکھتا ہوں کہ کون سی آیت کہاں اُتری کب اتری اور کس کی بابت اُتری اور دربارِ نبوی میں میں سوال کی جرأت بھی زیادہ رکھتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی زیادہ روایتیں آئی ہیں جو سابقین اولین میں سے تھے اور جن کا لقب اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ کی نعلین بھی اٹھاتے تھے، صاحب النعلین تھا انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی ستر سورتیں یاد کی تھیں اور اپنے تمام اندازِ عمل میں آپ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت پیدا کر لی تھی۔ ان کی وفات ۳۲ھ میں ہوئی۔ حضرت ابی بن کعبؓ خزرجی انصاری عہدِ رسالت میں کاتبِ وحی تھے اور صحابہؓ میں سید القراء اور قرآن کے عالم مانے جاتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں انتقال فرمایا۔ اور انہوں نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

حضرت زیدؓ بن ثابت کاتب دربارِ رسالت، نجباء انصار اور علماء قرآن میں سے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری رمضان میں قرآن کا جو دور فرمایا تھا اس میں شریک تھے، جس کی وجہ سے عہدِ صدیقیؓ میں جب قرآن ایک کتابؒ کی شکل میں جمع کیا گیا یہی اس کے جامع قرار پائے۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس ان کی رکاب تھاما کرتے تھے اور کہتے تھے کہ علماء کی تکریم اس طرح کرنی چاہیئے۔ ۴۵ھ میں وفات پائی۔ مگر ان دونوں حضرات یعنی ابی بن کعب اور زیدؓ بن ثابت سے تفسیر میں کم مروی ہیں۔ سب سے زیادہ روایتیں حضرت عبداللہ بن عباس

۱؎ مراۃ التفسیر صفحہ ۹ ۲؎ مکتوب (لکھا ہوا) قرآن، خود عہدِ رسالتمآبؐ میں موجود تھا۔ (طلوعِ اسلام مرحوم)

سے آئی ہیں جن کا لقب بوجہ قرآن دانی کے حبر امت اور ترجمان القرآن تھا۔ ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی تھی کہ

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ عَلِّمْہُ التَّاْوِیْلَ

اے اللہ اس کو دین کی فقاہت اور قرآن کی فہم عطا فرما۔

یہ اگرچہ خلفاء صحابہ میں سے تھے مگر حضرت عمرؓ ان کی عقلی و فراست اور قرآن فہمی کی وجہ سے ان کو اپنی مجلس شوریٰ میں شریک رکھتے اور مشکل امور میں رائے لیتے تھے۔ ان کا انتقال ۶۸ھ میں ہوا۔

ان حضرات کے علاوہ ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، انس بن مالک اور ام المومنین حضرت عائشہ و بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیریں منقول ہوئی ہیں۔

اکثر صحابہ کرام بہ نظر احتیاط انہیں معانی پر اکتفا کرتے تھے، جو بعض الفاظ یا آیات قرآن کی تشریح کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسموع ہوئے تھے۔ خود قرآن کی تفسیر میں کچھ کہنے سے پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ ابن سیرین نے کہا ہے کہ میں نے عبیدہ سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور سیدھے چلے چلو۔ لیکن بعض صحابہ مثلاً ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم قرآن میں تدبر اور تفکر کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جو چیز ناجائز تھی، وہ یہ تھی کہ بلا حقیقت کو پہچانے اور اچھی طرح سمجھے ہوئے آیات کی تفسیر کی جائے یا بعض اہل مذاہب مثلاً خارجی شیعہ، قدری، مرجی وغیرہ جو اس وقت پیدا ہو چکے تھے ان کے عقائد کے مطابق تاویل کی جائے۔

اس زمانہ میں تفسیر کے لئے عربی زبان، جاہلیت کے رسوم و عادات جن کو قرآن نے مٹایا ہے، عہد رسالت کے واقعات جن کا تعلق قرآن سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور قضایا وغیرہ کا جاننا ضروری تھا، انہیں کی مدد سے آیات کی تشریح کرتے تھے۔ قرآن میں دینی تعلیم کے علاوہ ایسے تاریخی حقائق بھی مذکور ہوئے ہیں جن کا علم اصلاح نفوس بشری کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً عالم کی تکوین، آدم کی پیدائش، اور انبیاء سابقین اور اقوام گزشتہ کے واقعات۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب کسی شے کا ذکر سنتی ہے تو اس کے متعلق مزید معرفت کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے عہد صحابہؓ میں لوگ ان امور کو ان علماء اہل کتاب سے جو اسلام لا چکے تھے، دریافت کرتے تھے۔ خود حضرت ابن عباسؓ جرامت بھی ابن جریر طبری کے بیان کے مطابق کعب احبار کے پاس بیٹھتے اور ان کی روایتوں کو اخذ کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کر دیا تھا کہ "اہل کتاب کے اقوال کی نہ تصدیق کرو، نہ تکذیب" مگر چونکہ ان امور کا تعلق اعمال شریعت کے ساتھ نہ تھا، اس وجہ سے ان کے لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ اس طرح پر اہل کتاب کی روایتیں بھی تفسیر قرآن میں شامل ہو گئیں۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ

اسرائیلیات

بالعموم عرب نہ پہلے سے اہل کتاب تھے، نہ علم رکھتے تھے۔ ان کے اوپر بدویت غالب تھی جب ان کو موجودات کے اسباب ابتدائے تخلیق اور امم سابقہ کے حالات وغیرہ کے جاننے کا شوق ہوتا، تو ان اہل کتاب

لہ فجر الاسلام صفحہ ۲۳۵

سے جو مسلمان ہو گئے تھے دریافت کرتے، یہ بھی زیادہ تر ان ہی کی طرح بدوی تھے اور ان امور کو اسی قدر جانتے تھے جس قدر عوام اہلِ کتاب، انہیں کے بیانات لوگوں سے منقول ہو کر آیات کی تفسیروں میں داخل ہو گئے۔ اور بوجہ اس کے کہ ان کا تعلق احکامِ شرعیہ سے نہ تھا تدوین کے وقت مفسروں نے مسامحت سے کام لے کر ان کی تنقید کی طرف توجہ نہیں کی اور انہیں کو کتب تفاسیر میں درج کر دیا[1]۔

عہدِ رسالت میں اہلِ کتاب میں سے جو حضرات اسلام لائے تھے ان میں سے سب سے پہلے یہودی عالم جن کو قرآنِ کریم نے "اَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ آيَةً أَن يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ" کہہ کر اہلِ علم میں شمار کیا ہے حضرت عبداللہؓ بن سلام ہیں، جو ہجرتِ نبوی کے بعد ہی مدینہ میں اسلام لائے، ان کا انتقال ۴۳ھ میں ہوا۔ ان سے حضرت ابوہریرہؓ اور انسؓ بن مالک نے روایت کی ہے۔ دوسرے حضرت سلمانؓ فارسی ہیں۔ یہ اصلاً مجوس بلکہ ایک آتشکدہ کے متولی کے عزیز فرزند تھے۔ گھر سے نکل کر شام میں گئے وہاں عیسائیت اختیار کر لی، ایک مدت تک نصیبین اور اس کے بعد عموریہ میں رہے اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل کیا پھر عرب کی طرف آئے وادی القریٰ میں بنی کلب نے غداری سے ان کو غلام بنا لیا اور فروخت کر ڈالا قسمت کی یاوری سے مدینے پہنچے۔ وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں مدائن میں وفات پائی[2]۔

جس طرح حضرت بلالؓ کو حبشیوں نے اور حضرت صہیبؓ کو رومیوں نے اپنا قومی افتخار اور نمونہ بنایا ہے طرح اہلِ فارس نے اسلام لانے کے بعد حضرت سلمانؓ فارسی کو اپنی قوم کا ہیئتی رو قرار دیا۔ ان کے حالات میں غیر معمولی باتیں بڑھائیں اور ان کی طرف بہت سی روایتیں منسوب کیں۔ بالخصوص صوفیۂ عجم نے جن میں سے اکثر اپنا سلسلۂ ارادت ان تک پہنچاتے ہیں۔

تیسرے صحابی جن سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں حضرت تمیمؓ داری ہیں جو ۹ھ میں مدینہ میں آکر مسلمان ہوئے تھے یہ نصاریٰ یمن میں سے تھے اور قصہ گوئی کرتے تھے، یعنی گزشتہ انبیاء اور اقوام کے حالات سناتے تھے حضرت عمرؓ کی خلافت میں اُن سے قصہ گوئی کی اجازت طلب کی مگر انہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ آخر میں ان کے بہت اصرار کی وجہ سے صرف اس قدر اجازت دی کہ جمعہ کے دن اس سے پہلے کہ میں جماعت کے لئے نکلوں، تم قصے سنا لیا کرو۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کو ہفتہ میں دو دن کی اجازت مل گئی[3]۔ جساسہ اور دجال کی روایتیں انہیں سے مروی ہیں۔

اس قصہ گوئی کی دو صورتیں ہوتی تھیں۔ ایک قصص عامہ کہ قصاص مسجد میں مسلمانوں کے مجمع میں بیٹھ کر ان کو دوسری قوموں کے وہ حکایات اور حالات سناتا، جو اس نے اپنے بزرگوں سے سنے تھے، دوسری قصص خاص جو کسی مخصوص بڑے آدمی کے سامنے بیان کئے جاتے تھے[4]۔ عہدِ صحابہؓ ہی میں قصہ گوئی کا رواج عوام کی دلچسپی کی وجہ سے بہت بڑھ گیا اور چونکہ قصے کذب آمیز بلکہ زیادہ تر بے بنیاد افسانے ہوتے تھے اس وجہ سے حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں قصہ گویوں کو مسجدوں میں بیٹھنے کی ممانعت کر دی۔ بجز حسن بصریؒ کے کہ وہ سچائی کا خیال رکھتے تھے[5]۔

---

[1] مقدمہ صفحہ ۳۶۷ [2] طبقات ابن سعد جلد ۴ صفحہ ۵۳ [3] اصابہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۴ [4] خطط مقریزی جلد ۲ صفحہ ۲۵۳
[5] فجر الاسلام صفحہ ۱۸۸

تابعین

عہدِ صحابہ کے بعد روایت تفسیر میں مندرجہ ذیل حضرات نے زیادہ شہرت پائی:۔

عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ جو ان کے مخصوص ترین شاگرد بھی تھے۔ یہ اپنے آقا یعنی عبد اللہ بن عباسؓ، نیز حضرت عائشہؓ و ابوہریرہؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

عطاء بن رباح۔ یہ حضرت عثمان، اسامہ بن زید، حضرت عائشہ، ام سلمہ، ابوہریرہؓ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ علماء مکہ میں فتوے کی ریاست انہیں پر منتہی تھی۔ ۱۱۴ھ میں وفات پائی۔

ضحاک بن مزاحم خراسانی۔ یہ حضرت ابن عباس، ابن عمر، زید بن ارقم اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ان کی تاریخ وفات ۱۰۵ھ ہے۔

سعیدؒ بن جبیر کوفی۔ یہ ابن عباس، عدی بن حاتم اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کے حکم سے قتل کئے گئے۔

مجاہدؒ بن جبیر۔ یہ بھی حضرت ابن عباس کے شاگرد ہیں اور زیادہ انہیں سے روایت کرتے ہیں۔ ۱۰۳ھ میں مکہ میں عین سجدہ کی حالت میں وفات پائی۔

حسن بصریؒ۔ یہ انس بن مالک، جندب بن عبد اللہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ۱۱۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے علاوہ امام مسروق، زید بن اسلم، قتادہ، ابو العالیہ، ربیع بن انس اور عوفی وغیرہ۔ اس طبقہ کے علماء تفسیر میں ممتاز ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ تفسیر کا علم زیادہ علماء مکہ میں تھا جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ مثلاً عکرمہ، مجاہد اور عطا، پھر اہل کوفہ میں جو حضرت ابن مسعودؓ کے اصحاب تھے، جیسے حسن بصریؒ اور مسروقؓ وغیرہ۔

اس عہد میں اسرائیلیات میں بہت اضافہ ہوا، کیونکہ عوام کا رجحان ان کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ اس کو علمی تحقیق سمجھنے لگے تھے کہ قرآن میں جن انبیاء اور اقوام کے قصص ہیں، ان کے متعلق مزید حالات کا پتہ لگائیں۔ اس لئے جزئی سے جزئی اور چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی دریافت کرنے لگے۔ مثلاً سفینۂ نوحؑ کی مقدار اور وسعت، اس میں جن جانداروں کے جوڑے لادے گئے تھے، ان کے اقسام، حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں چاروں پرندوں کے انواع، حضرت خضر کے ذکر میں غاصب بادشاہ کا خاندان اور اس بچہ کا نام و نسب جس کو خضر نے قتل کیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں ان کی بیوی کے متعلق تحقیق کہ وہ حضرت شعیبؑ کی چھوٹی بیٹی تھیں یا بڑی۔ پھر یہ کہ انہوں نے آٹھ یا دس سال کی دونوں مدتوں میں سے کون سی مدت پوری کی۔ اصحاب کہف کے نام اور ان کے کتے کے رنگ و نسل، غرض اسی قسم کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں امور کی بابت جن کو قرآن کریم نے لایعنی اور غیر ضروری ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا، بحث و تفتیش کرنے لگے۔ یہی معلومات روایات کے ذریعہ سے پھیلیں اور جب تفسیریں مدون ہوئیں تو ان میں درج کی گئیں۔ ان روایات کا سب سے بڑا مرجع دو شخص ہیں ایک کعب بن ماتع جو یمن کے یہودی تھے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لائے اور مدینہ میں رہنے لگے۔ یہ کعب احبار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان سے حضرت عباسؓ اور ابوہریرہؓ کے توسط سے زیادہ روایتیں آئی ہیں۔ دوسرے وہب بن منبہ یہ بھی یمن کے یہودی مگر فارسی الاصل تھے۔ ان کی وفات صنعاء میں ۱۱۴ھ میں ہوئی۔ اسرائیلیات میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ علماء ثقات مثلاً ابن قتیبہ

یا امام نووی وغیرہ نے ان کی کوئی روایت اپنی کتابوں میں درج نہیں کی۔ ابن جریر طبری نے اگرچہ ان سے قطعی پرہیز تو نہیں کیا ہے مگر بہت کم روایتیں لی ہیں۔ لیکن ثعلبی وغیرہ نے انبیاء کے قصوں میں زیادہ تر انہیں کی مرویات درج کی ہیں۔ یہاں اس حقیقت کا بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عرب کے ہر حصہ سے زیادہ یہودی ثقافت یمن میں شائع تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے اہل کتاب مسلمانوں سے اس قسم کی روایتیں زیادہ منقول ہوئیں۔

اتباع تابعین — اس طبقہ میں بالعموم حاملین روایت کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ ان میں سے جن کے نام تفسیر کے ساتھ مشہور ہوئے حسب ذیل ہیں:-

عطاء بن دینار متوفی ۱۲۶ھ میں مقاتل بن سلیمان متوفی ۱۵۰ھ، سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ، وکیع بن الجراح متوفی ۱۹۷ھ، سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ نیز ابن جریج، اسحاق بن راہویہ، آدم بن ایاس، عبد الرزاق، اور امام مالک وغیرہ۔
اس طبقہ کے لوگوں نے تفسیر میں کتابیں بھی مدون کرنی شروع کیں۔ چنانچہ تاریخوں میں ان میں سے بعض تفاسیر کا ذکر ہے مثلاً تفسیر ابن جریج۔ تفسیر سفیان بن عیینہ، تفسیر وکیع بن الجراح، تفسیر شعبہ، تفسیر ابی بکر بن ابی شیبہ وغیرہ۔ مگر یہ سب کی سب ضائع ہو گئیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی امت کے ہاتھوں میں باقی نہیں رہی۔

ان کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے شیوخ سے جو روایتیں قرآن کی تفسیر میں سنتے، ان کو قلمبند کر لیتے تھے۔ بڑا حصہ اسرائیلیات کا ہوتا تھا، جس کی وجہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔ اس طبقہ میں ان روایات کے بطل کبیر ابن جریج ہیں، جن کی نسبت بعض ائمہ جرح و تعدیل نے تصریح کی ہے کہ روایتیں وضع کرتے تھے۔[۱] یہ ۔۔۔ھ میں اسلام لائے تھے اور ۱۵۰ھ میں انتقال کر گئے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ رومی الاصل تھے اور امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ ابن جریج نے ۹۰ عورتوں سے متعہ کیا تھا۔[۲] ابن خلکان کے بیان کے مطابق سب سے پہلی تفسیر اسلام میں انہوں نے ہی مدون کی۔ تبع تابعین کا سلسلہ دوسری صدی ہجری کے خاتمہ تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد ان کے شاگردوں کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد یعنی تیسری صدی ہجری میں تدوین کتب عام ہو گئی۔ اسی میں صحاح ستہ لکھی گئی، جن میں تفسیر کی روایتیں کتاب التفسیر کے عنوان سے سورتوں کی ترتیب پر جمع کی گئی ہیں۔ ان کا بھی عام انداز وہی ہے جو ان کے اساتذہ کا تھا، یعنی انہوں نے جستہ جستہ الفاظ و آیات قرآن کے متعلق متقدمین سے جو روایتیں سنی ہیں ان کو درج کر دیا ہے۔ یہ روایتیں بالعموم صحابہ کرام یا ان کے تلامذہ کی ہیں، خال خال ہیں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔ مرفوع ہیں۔ کتب صحاح ستہ کے تفسیری سے یہ ابواب اس قدر مختصر ہیں کہ کسی سورہ کے ایک یا دو لفظوں اور کسی ۔۔۔ ایک یا دو آیتوں کے متعلق روایات درج کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ روایات قرآن کی تفسیر کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر خود ان سے ان کا کوئی گوشہ بھی سیراب نہیں ہوتا۔

تنقید و تفسیر — زیادہ تر اسی زمانہ میں یعنی تیسری صدی ہجری میں ائمہ جرح و تعدیل نے راویوں اور روایتوں کی تنقید کی، تفسیری روایات کا بڑا حصہ بوجہ ان کے رواۃ کے ضعف کے مشکوک ثابت ہوا۔ کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان، ابو صالح مصری، محمد بن سائب کلبی، السدی محمد بن مروان، بشر بن عمارہ اور

---

[۱] فجر الاسلام صفحہ ۱۹۰ [۲] فجر الاسلام صفحہ ۲۴۲ [۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ا صفحہ ۱۵۳

عوفی وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں جانچنے سے کمزور بلکہ بعض ان میں وضاع نکلے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صحابہ کرامؓ میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے نام سے تفسیر کی روایتیں زیادہ آئی ہیں اور یہی رواۃ کی کمزوری کی وجہ سے عام طور پر موضوع اور مجعول نکلیں جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے شیعہ انہیں اقوال کو زیادہ احترام اور قبولیت کی نظر سے دیکھتے تھے جو ان کے نام کے ساتھ منسوب ہوں، اس لئے شیعہ رواۃ بیشتر انہیں کے نام سے روایتیں کرتے تھے، بلکہ جو بات ان کے ذہن میں ایسی آتی تھی جس سے حضرت علیؓ کا رتبہ ظاہر ہو اس کو بھی ان کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی حمرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں اگر چاہوں تو صرف فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کا بوجھ تیار کر دوں[1]۔ وضع کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نام سے جو روایات کی گئی ہیں اُن کی کل تعداد ۶۸۲ ہے جن میں سے ائمہ حدیث کے نزدیک اصول کی رو سے صرف پچاس صحیح ہیں[2]۔

حضرت ابن عباسؓ جن کی نسل سے خلفاء عباسیہ تھے، مقربین بارگاہ کا مخصوص موضوع تھے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ خالی نہ ہوگا جس کی تفسیر میں ان سے روایت نہ کی گئی ہو ان کی کل روایتوں کی تعداد ۱۶۶ ہے۔ جن میں سے امام شافعی کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں جو صحیح مانی گئی ہیں[3]۔

ابن عباسؓ سے روایت کے جتنے طرق ہیں، ان میں سب سے معتبر طریقہ، ابن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس ہے، مگر جملہ حفاظ حدیث کا اجماع ہے کہ علی بن ابی طلحہ کی لقاء حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ ان کے نام سے کہتے ہیں، دراصل مجاہد اور سعید بن جبیر کی روایتیں ہوتی ہیں۔ دوسرا طریق جس کو محدثین نے شیخین یعنی امام بخاریؒ اور مسلمؒ کی شرط کے مطابق تسلیم کیا ہے۔ قیس عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ ہے۔ مگر اس سلسلہ سے صرف چند ہی روایات ہیں۔ باقی دوسرے تمام طرق مجروح ہیں۔ جو بہ عن ضحاک سخت ضعیف سلسلہ ہے۔ ابن جریج نے جو کچھ روایت کیا ہے، اس میں صحت کا خیال ہی نہیں رکھا۔ کلبی کی روایتیں سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ حبیب مروان بن محمد بھی شامل ہو جائے تو یہ سلسلہ سرتاپا کذب ہو جاتا ہے[4]۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بناء پر بعض اکابر ائمہ نے تفسیری روایتوں کی صحت کا سرے سے انکار ہی کر دیا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل جو جرح و تعدیل کے امام اور بخاریؒ اور مسلمؒ کے استاد ہیں کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، مغازی، ملاحم اور تفسیر[5]۔

ہر چند کہ امام موصوف کے اس قول میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے لیکن ان کے تلامذہ نے کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ بیشتر حصہ ان روایات کا ناقابل اعتماد ہے۔ غالباً اسی تاویل سے ان کا منشا یہ ہے کہ ائمہ حدیث نے جن تفسیری روایتوں کو اصول حدیث کے مطابق صحیح قرار دیا ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جو روایتیں صحیح قرار دی گئی ہیں ان میں بھی تنقید کی ضرورت ہے۔ مثلاً القناطیر المقنطرۃ کی تفسیر میں امام حاکم

---

[1] مرآۃ التفسیر صفحہ ۲۰ سے صفحہ ۲۸ تک۔ [2] فجر الاسلام صفحہ ۲۳۸ [3] الملل والنحل لابن حزم جلد ۴ صفحہ ۱۳۷ [4] مرآۃ التفسیر صفحہ ۱۳
[5] اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۹۵ [6] اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۹۵ [7] تذکرۃ الموضوعات للشیخ محمد طاہر صفحہ ۸۲۔

سے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ بارہ ہزار اوقیہ کا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی صحیح ہوسکتی ہے۔ مگر محدثین نے دونوں کو صحیح کہا ہے[1]۔

مکمل تفسیریں تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری میں پورے قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں۔ مثلاً تفسیر ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ۔ تفسیر ابن منذر متوفی ۳۱۸ھ۔ تفسیر ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ۔ تفسیر امام حاکم متوفی ۳۵۹ھ۔ تفسیر ابن حبان متوفی ۳۶۹ھ وغیرہ ان میں سے ہر ایک نے صحابہؓ تابعین اور ان کے بعد کے علماء سے روایات درج کی ہیں خود اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی ہے۔ بجز ابن جریر طبری کے جن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر آیت کو نقل کرنے کے بعد اس کے ایک ایک لفظ کے معانی لکھتے ہیں۔ متقدمین کے جو اختلافات ہوتے ہیں ان کو اسناد کے ساتھ درج کرتے ہیں، پھر خود ان میں سے ایک کو ترجیح دے کر اس کے وجوہ لکھ دیتے ہیں۔ الفاظ سے گزر کر آیات کے مفہوم کے متعلق بھی ان کا رویہ بعینہٖ یہی ہے۔ کہیں کہیں استنباطِ مسائل اور وجوہ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔ الغرض ان کی تفسیر اسلام میں پہلی تفسیر ہے جس میں مؤلف نے اپنی دماغی کوشش اور ذہنی کاوش سے بھی کام لیا ہے، اور ہر موقع پر اس کی شخصیت نظر آتی ہے۔ درا صل ان کی تفسیر اس کل قرآنی علم کا مجموعہ ہے جو اس وقت تک علماء اسلام کے پاس تھا۔ امام نودی نے لکھا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ ابن جریر طبری جیسی تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ امام ابوحامد اسفرائینی کا قول ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر کر کے بھی تفسیر طبری کو حاصل کر لیا تو کوئی بڑی زحمت نہیں اٹھائی۔ آج روئے زمین پر پورے قرآن کی سب سے پہلی تفسیر یہی ہے۔ یہ اُمّ التفاسیر بولی جاتی ہے، کیونکہ زمانۂ مابعد میں جتنی تفسیریں لکھی گئیں سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ اس میں خرابی ۔ ۔ ۔ یہ ہے کہ رطب ویابس ہر قسم کی روایات درج کر دی گئی ہیں[2]۔ لیکن چونکہ سند ہر روایت کی اس کے ساتھ ہے، اس وجہ سے جانچنا نہایت آسان ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد رشید حافظ ابن کثیر نے اسی کا خلاصہ اور تنقیح کر کے اپنی تفسیر مرتب کی ہے۔

علمی تفسیریں اب تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی تھیں، وہ خالص منقولی تھیں، یعنی روایات کا مجموعہ، لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں مختلف قسم کی علمی تحریکات پیدا ہو گئی تھیں۔ صرف ونحو، بلاغت ومعانی، فقہ واصول، منطق وفلسفہ، کلام وتصوف وغیرہ کا عام رواج ہو چکا تھا۔ ان علوم کے حاملین نے جو تفسیریں لکھیں ان میں بیشتر اپنے فنی زاویۂ نظر سے الفاظ وآیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں اور روایات کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا۔ علاوہ بریں نئے نئے مذہبی فرقے بھی پیدا ہو گئے تھے۔ ان اہلِ مذاہب نے بھی اپنے اپنے عقائد وخیالات کے مطابق آیاتؔ کی تفسیریں کیں، جن کی وجہ سے اختلافات کی بہت کثرت ہو گئی اور تفسیروں کی نوعیتیں متعدد ہو گئیں۔ مثلاً زجاج اور کسائی وغیرہ نے جو صرف ونحو کے امام تھے اپنی تفسیروں میں خصوصیت کے ساتھ لفظی تصرفات اور وجوہ اعراب سے بحثیں کیں۔ ثعلبی اور ابن اثیر

---

[1] اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۹۹ [2] مراۃ التفسیر صفحہ ۳۸ [3] اسی وجہ سے اسے قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاسکتا۔ (طلوع اسلام)

بنے جن کو تاریخ کا ذوق تھا قصص کی تفصیلوں کی طرف رجحان رکھا۔ فقیہہ ابواللیث سمرقندی اور علامہ قرطبی نے فروعاتِ فقہیہ پر آیات سے استدلال میں توجہ صرف کی۔ ابومسلم اصفہانی اور زمخشری نے معتزلی عقائد کے اثبات کی کوشش کی۔ اشعر ایکینی اور رازی نے اشعری اصول کے مطابق متکلمانہ بحثیں لکھیں۔ عبدالقاہر جرجانی اور ابوہلال عسکری نے بلاغت و معانی کے لطائف ظاہر کئے۔ محی الدین ابن عربی اور واحدی وغیرہ نے تصوّف کا رنگ بھرا اور شیعہ مفسروں نے آیات کو اپنے مذہبی خیالات کے مطابق بنانے سے سروکار رکھا۔ غرض اس وقت سے لے کر مفتی محمد عبدہ اور سرسید احمد خاں تک ہر زمانہ کی تفسیر اس زمانہ کی علمی بحثوں اور تحریکوں سے متاثر اور ہر فرقہ کی تفسیر اس کے عقائد و خیالات کی آئینہ نظر آتی ہے۔

ان وجوہات سے اگرچہ تفسیروں میں وسعت تو بہت پیدا ہوگئی، لیکن بیجا تاویلات کا بھی راستہ کھل گیا اور اکثر فرقوں نے آیاتِ قرآن کو اپنے خیالات کے مطابق اس طرح ڈھالنے کی کوششیں کیں، جن کو معنوی تحریف کہنا بجا ہے۔ اس بے اعتدالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تفسیر کے اصول نہیں متعین کئے گئے علماءِ اصول نے جو کچھ لکھا ہے وہ الفاظ کے استعمال کے متعلق چند عام قیاسی قاعدے ہیں، جو بالکل ناکافی ہیں۔ علامہ فناری نے تصریح کی ہے کہ علم تفسیر میں بجز چند امور کے اصول مطلقاً نہیں ہیں، جس پر ان کی جزئیات کا مدار ہو۔[1]

شرائطِ تفسیر متاخرین نے مفسر کے لئے کم سے کم پندرہ علوم جاننے کی شرائط لگائی ہے۔ لغت، اشتقاق، صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، قرآت، کلام (اصول دین) اصول فقہ، اسبابِ نزول، قصص، ناسخ و منسوخ، فقہ اور حدیث۔[2]

لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ یہ تمام علوم مسلمانوں میں دوسری بلکہ تیسری صدی ہجری میں رائج ہوئے ہیں، جس سے پہلے ہی قرآنِ کریم کو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ اور تبع تابعینؒ صحیح اور بہتر طریقہ سے سمجھتے رہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان علوم مشروطہ کا ماخذ خود قرآن ہے۔ اسی سے علماء نے ان کو نکالا ہے۔ پھر یہ فہم قرآن کے لئے شرط کیونکر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ غالباً ان لوگوں کا مقصد جنہوں نے ان علوم کو شرط گردانا ہے یہ ہوگا کہ ان سے فہم قرآن میں مدد ملتی ہے، ورنہ ان میں سے اکثر تو قیاسی علوم ہیں، جن میں غلطی کے پہلو بھی نکل آتے ہیں۔ چنانچہ وہ مفسرین جن کی تفسیروں کو علماء نے قابل اعتراض قرار دیا ہے، نہ صرف یہ کہ ان علوم سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ اپنی تفسیروں میں ان کے اصول کو مرعی بھی رکھتے تھے۔

کتبِ تفسیر امام ابن جریر طبری کے بعد جس قدر تفسیریں لکھی گئیں ان کو کون شمار کر سکتا ہے؟ صرف کشف الظنون میں جو ایک کتب خانہ کی فہرست ہے، نو سَو تفسیریں نام بنام مندرج ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنی کتاب اکسیر میں اس سے بھی زیادہ تفسیریں گنائی ہیں۔ اگر دنیا کے تمام کتب خانوں کی فہرستیں دیکھ کر ان کی تعداد لکھی جائے تو آج بھی یقیناً کئی ہزار تک پہنچے گی۔ اس موقع پر بہ ترتیب زمانہ چند مشہور تفسیروں کا نام لکھنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

۱؎ مرآۃ التفسیر صفحہ ۷، ۲؎ اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۸۰

چوتھی صدی ہجری میں تفسیر ابوالحسن اشعری امام اہلِ سنت متوفی ۳۳۰ھ، تفسیر محمد بن علی ادفوی متوفی ۳۸۸ھ، اس کا نام استغنا فی علوم القرآن ہے اور ایک سو بیس جلدوں میں ہے۔ تفسیر خلف بن احمد والی سیستان متوفی ۳۹۹ھ یہ تفسیر سجستانی کے نام سے مشہور ہے اور سب سے بڑی تفسیر ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں تفسیر ابن فورک متوفی ۴۰۶ھ، تفسیر ابن ابوطالب مکی متوفی ۴۳۷ھ، تفسیر امام ماوردی متوفی ۴۵۰ھ، تفسیر ابومسلم اصفہانی متوفی ۴۵۹ھ، تفسیر امام اسفرائینی متوفی ۴۷۱ھ، تفسیر امام الحرمین استاد امام غزالی متوفی ۴۷۸ھ، تفسیر راغب اصفہانی متوفی ۵۰۰ھ۔ چھٹی صدی ہجری میں تفسیر امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ جس کا نام یاقوت التاویل ہے اور چالیس جلدوں میں ہے۔ تفسیر امام بغوی محی السنۃ متوفی ۵۱۶ھ، تفسیر کشاف جاراللہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ، تفسیر امام ابن الجوزی بغدادی متوفی ۵۹۷ھ،

ساتویں صدی ہجری میں تفسیر امام رازی متوفی ۶۰۶ھ، تفسیر شیخ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۲۸ھ، تفسیر سخاوی متوفی ۶۴۳ھ، تفسیر بیضاوی متوفی ۶۸۲ھ۔

آٹھویں صدی ہجری میں تفسیر خازن شیخ علاؤالدین علی بن محمد بغدادی متوفی ۷۲۵ھ، تفسیر بحر المحیط ابوحیان اندلسی۔

نویں صدی ہجری میں تفسیر علامہ مجدالدین فیروز آبادی صاحبِ قاموس متوفی ۸۱۷ھ، تفسیر امام بلقینی متوفی ۸۲۴ھ۔

اس کے بعد جو تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر انہیں تفسیروں کا خلاصہ یا التقاط ہیں۔ ان کے نام گنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ان چند تفسیروں کا ذکر ضروری ہے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے امتیاز رکھتی ہے ان میں سب سے مقدم ابن جریر طبری کی تفسیر ہے جس کی مختصر کیفیت ہم لکھ چکے ہیں۔ ہر زمانہ میں اہلِ علم اسی کو سب سے بہتر تفسیر تسلیم کرتے چلے آئے ہیں، گویا تشریح قرآن کے لحاظ سے وہی پہلی تفسیر ہے اور وہی آخری تفسیر، آج تک کوئی تفسیر اس کے رتبہ کی نہیں لکھی جا سکی[1]۔

دوسری تفسیر جس نے علماء ادب میں شہرت حاصل کی کشاف ہے۔ اس کے مؤلف علامہ زمخشری بلاغت و معانی کے امام تھے، انہوں نے اسی نوعیت سے یہ تفسیر لکھی، لیکن زیادہ زور پہلے ہی پارہ کی تفسیر میں صرف کر دیا ہے مگر اس میں اپنی فن دانی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔

تیسری تفسیر جو علماء معقول میں مقبول ہوئی امام فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر ہے، اس میں طویل الذیل فلسفیانہ بحثیں ہیں یہ اس زمانہ میں لکھی گئی جب عالمِ اسلام میں منطق، فلسفہ اور علم کلام زیادہ رائج تھا۔ اس واسطے بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی، لیکن اہلِ منقول نے اس کو پسند نہ کیا، کیونکہ علاوہ اس کے کہ اس میں بعض باتیں ان کے قدیم خیالات کے مطابق نہ تھیں، ان کو آیات کے ساتھ ان متکلمانہ مباحث کا جوان کے تحت میں لکھے گئے ہیں۔ ربط نظر نہ آیا، یہاں تک کہ بعض بزرگوں نے کہہ دیا کہ "رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے بجز تفسیر کے"۔ امام رازی نے ربط آیات کی طرف بھی جابجا اشارات کئے ہیں۔ مگر ہر جگہ اس کا خیال نہیں رکھا۔ ان کے

---

[1] اس کی خرابی حضرت علامہؒ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس میں رطب و یابس ہر قسم کی روایات درج کر دی گئی ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

بعد علامہ شرف الدین ابوالفضل متوفی ۶۵۵ھ نے اپنی تفسیر میں جو بیس جلدوں میں ہے اور تفسیر مرسیی کے نام سے مشہور ہے ہر ہر آیت کے باہمی ربط اور اس کے وجود کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی۔ اسی عنوان پر شیخ علی مہائمی متوفی ۸۲۵ھ نے جن کا مزار بمبئی میں زیارت گاہ ہے اپنی تفسیر تبصیر الرحمٰن لکھی پھر شیخ ابراہیم بقاعی متوفی ۸۸۵ھ نے تفسیر بقاعی تالیف کی، جو فی الجملہ اس سے بہتر سمجھی گئی۔ اس آخری زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی بھی ربط آیات کے عنوان سے تفسیر نظام القرآن عربی زبان میں لکھ رہے تھے، جو ان کے انتقال کر جانے کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی۔ صرف اس کے بعض اجزاء شائع ہوئے ہیں۔

آیات کے علاوہ سورتوں کی ترتیب اور ان کے باہمی تناسب پر شیخ ابوحیان نے اپنی تفسیر البرہان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن لکھی ہے۔ شیخ ابوالفیض فیضی اکبر آبادی متوفی ۱۰۰۴ھ کی تفسیر سواطع الالہام کسی معنوی خوبی کے لحاظ سے نہیں۔ بلکہ صرف اس وجہ سے قابلِ ذکر ہے کہ غیر منقوط الفاظ میں لکھی گئی ہے۔

موجودہ دور میں شیخ جوہری طنطاوی کی تفسیر مغربی علوم کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ لیکن علمی لحاظ سے بہترین تفسیر شیخ محمد عبدہٗ کی ہے جس کی تکمیل ان کے شاگرد رشید رضا، مدیر رسالہ "المنار" مصر کر رہے تھے، مگر افسوس ہے کہ ابھی نصف قرآن تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ سید صاحب موصوف انتقال کر گئے اور یہ مفید تفسیر ناتمام رہ گئی۔

نصابِ درس کے لئے علماء اہلِ سنت کو صحت مفہوم اور اختصار دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے سب سے بہتر تفسیر جلالین ملی، جو نصف قرآن تک شیخ جلال الدین محلی متوفی ۸۶۴ھ اور بقیہ نصف شیخ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس قسم کی مختصر تفسیر مدارک بھی ہے جو علامہ نسفی کی تالیف ہے اور بعض مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ تفسیر بیضاوی کا ابتدائی حصہ سورۂ بقرہ تک بھی پرانے مدارس میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ بیضاوی دراصل تین اہم علمی تفاسیر کا خلاصہ ہے۔ جہاں تک معانی و بیان کا تعلق ہے کشاف سے ماخوذ ہے۔ متکلمانہ بحثیں تفسیر کبیر رازی سے اور حقائق و لطائف تفسیر راغب اصفہانی سے[1]

علومِ قرآن

جب سے مسلمانوں میں مختلف علوم کا رواج ہوا اسی وقت سے اہل فن نے قرآن کے ایک ایک شعبہ پر جداگانہ بحثیں شروع کیں، اور ان کے متعلق کتابیں تصنیف کرنے لگے۔ مثلاً لغات القرآن، اعراب القرآن، بدائع القرآن، قصص القرآن، احکام القرآن اور صحیح القرآن وغیرہ۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں ان علوم کی اسی انواع کا شمار کیا ہے اور ان کے ادپر جو مشہور تصنیفیں ہیں، ان کو گنایا ہے، لیکن دراصل ان انواع کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے اور ہر ایک بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر تصانیف کے انبار ہیں۔ مثلاً الفاظ القرآن، اس پر بہت سے علماء ادب و لغت نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے ابوعبیدہ، ابوعمرو زاہد اور ابن درید کی کتابیں مشہور ہیں، ان سب کا مجموعہ العزیزی کی کتاب ہے، جس کو انہوں نے اپنے استاد ابوبکر ابن الانباری کی معیت پر پورے پندرہ سال

---

[1] قضاء الارب صفحہ ۲۳۸

کی محنت میں تیار کیا ہے۔ آخر میں راغب اصفہانی نے مفردات القرآن لکھی جو الفاظ قرآن کے متعلق سب سے مفید تر کتاب تسلیم کی گئی ہے۔

اسی طرح اعجاز القرآن پر امام خطابی، رمانی، زملکانی، فخر الدین رازی، ابن سراقہ اور ابوبکر باقلانی کی کتابیں ہیں۔ اس زمانہ میں مصر کے نامور ادیب مصطفیٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب آداب العربیہ کی دوسری جلد پوری اسی عنوان پر لکھی ہے جو سب سے بہتر، جامع اور دلکش تصنیف ہے۔ علیٰ ہذا اقسام القرآن، امثال القرآن، متشابہات القرآن، مبہمات القرآن، بلکہ آیات، الفاظ، اور حروفِ قرآن کی تعداد وغیرہ تک کوئی عنوان ایسا نہیں ہے، جس پر تصنیفیں نہ ہوں۔ یہاں تک کہ خواص القرآن یعنی آیات سے تعویذات عملیات اور نقوش وغیرہ پر بھی تمیمی، امام غزالی اور یافعی وغیرہ نے کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔

قرآنی علوم پر یہ کتابیں مفسروں کے لئے کارآمد ذخیرہ ہیں جن سے وہ اپنی تفسیروں میں مدد لیتے ہیں۔

نقائصِ تفسیر

گزشتہ صفحات میں ان خرابیوں کی طرف جو تفسیروں میں واقع ہوئیں ضمناً اشارات کئے گئے ہیں۔ اب میں ان کے بڑے بڑے نقائص کو تفصیل وار بیان کر دیتا ہوں

(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان مفسرین نے قرآن کی تشریح کے اصول مقرر نہیں کئے۔ علماء اصول نے جو قواعد لکھے ہیں اوّل تو وہ مخصوص قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر نہیں مرتب کئے گئے ہیں، بلکہ عام ہیں اور زیادہ تر ان کا تعلق الفاظ سے ہے دوسرے ان کی بناء محض قیاس پر ہے جس میں ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش اور غلطی کا احتمال ہے۔ تیسرے وہ صرف چند قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں زمانۂ مابعد میں امام ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے اس ضرورت کو محسوس کر کے اصول لکھنے شروع کئے مگر نامعلوم وجوہ سے صرف تمہید ہی لکھ کر رہ گئے آخری زمانہ میں شاہ ولی اللہ مرحوم دہلوی نے اصولِ تفسیر میں ایک رسالہ فوز الکبیر لکھا ہے۔ لیکن اس میں بعض صرف ایسے مطالب کی مختصر تشریحات ہیں جن سے فہم قرآن میں مدد مل سکتی ہے۔ ان کو اصول نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ محدود ضوابط نہیں ہیں جن سے کوئی مخصوص طریقہ تفسیر کا متعین ہو سکے، بلکہ وہ شاہ صاحب کے فہم قرآن کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں اور بس۔

الغرض تفسیر قرآن کے اصول قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں، حالانکہ سب سے پہلا کام یہی تھا۔ اس لئے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں، کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک ممتاز مفسر علامہ فناری کا قول نقل کر چکا ہوں کہ تفسیر کے لئے بجز چند معمولی قاعدوں کے اصول مطلقاً نہیں ہیں۔ جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو

(مراۃ التفسیر صفحہ ۸)

(۲) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے، وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے۔ یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور خاتمہ تک پہنچا دیتے ہیں اس طرح آیات و الفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا۔ یعنی اس کی کوئی تعلیم حاصل نہیں ہوتی اس لئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں، بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں

میں اس کے طول و عرض میں بتدریج اتاری گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے، اس مسئلہ کی پوری قرآنی تعلیم ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتی، لہٰذا، ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں، قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہوسکتی۔ فہم قرآن کے لئے ان تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو فنِ طب میں کتب مفردات کی ہے جن میں حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام، خواص، آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہوسکتا۔ بجنسہٖ اسی طرح ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائقِ قرآنی کا عالم نہیں ہوسکتا۔

(۳) اکثر تفاسیر میں آیات و الفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں اور تفسیری روایات کی بابت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل نے جن کے اوپر حدیث کی امامت منتہی ہوئی کہدیا ہے کہ تفسیری روایتیں تمام تر بے اصل ہیں۔ قصص میں اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر ناقابلِ اعتبار ہیں۔ یہی حال اسبابِ نزول کی روایتوں کا ہے۔ قدیم مفسروں نے ان روایتوں کے سلسلۂ اسناد بھی لکھے تھے۔ جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز ہوسکتی تھی۔ مگر متاخرین نے ان کو بھی حذف کر دیا۔ اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے، جس کے باعث عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہوگئی اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں اُمت میں رائج ہوگئیں۔ یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی .... اسی قدر مسلمانوں کو قرآنِ کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بعد ہوتا گیا۔

(۴) ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے اِلّا ماشاءاللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں بعض بزرگ تو اس قسم کے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں۔ یعنی تقرباً الی اللہ خدامِ قرآن میں داخل ہوگئے، حالانکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی، جس پر کسی طالبِ قرآن کی زبان سے ان کے لئے مغفرت کی دعا نکلے، یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کوئی تلافی ہوسکے۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں جو معدوم یا متروک ہوگئیں، کیونکہ یہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے سکھلایا ہے کہ "وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ" وہی چیز دنیا میں رہے گی جو لوگوں کے لئے نفع رساں ہوگی۔

جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے اپنے خاص عقیدوں کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے محض جدتِ طبع دکھائی ہے، مثلاً ابن فورک نے حضرت ابراہیمؑ کے قول لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے۔ یا كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ کی تفسیر میں بعضوں نے کہا ہے کہ سجل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام تھا۔ حالانکہ تمام ائمہ حدیث و تاریخ متفق ہیں کہ اس نام کا کوئی صحابی نہیں ہے۔ یا مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ کی تفسیر علی و فاطمہ اور لولو والمرجان کی تفسیر حسنین رضی اللہ عنہم یا الصَّابِرِيْنَ والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین کی تفسیر میں صابر سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صادق سے صدیق، قانت سے عمر فاروق، منفقین سے عثمان غنی

اور مستغفرین سے حضرت علی رضی اللہ عنہم غرض اسی طرح کی سیکڑوں آیات ہیں جو ان حضرات نے منسوخ کی ہیں[1]۔

(۵) یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں، ان کی تو کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں، غرض اس نسخ کے عقیدہ نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

(۶) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں۔ مثلاً غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ کی تفسیر میں دس قول ہیں؛ وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ کی متعدد تفسیریں ہیں وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی ہاشمی تھے۔ الغرض سیکڑوں، الفاظ و آیات ہیں جن کی کئی کئی تفسیریں یا، یا کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ ان میں سے صحیح مفہوم کے فیصلہ کی قوت خود ان کے اندر مفقود ہوتی ہے حالانکہ صحیح مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کی توضیح ہو وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

(۷) ان مفسروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے جنت کا ذکر ہے تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے۔ جنگ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کے بجائے ان کے چہروں گھوڑوں اور عمامہ کے رنگ اور ان کی سواری و حملہ و قتال کی کیفیت لکھیں گے۔ یاجوج و ماجوج کے تاریخی حالات بیان نہیں کریں گے۔ بلکہ کوئی لکھے گا کہ ان کے قد اس درخت سے مشابہ ہیں، جو ملک شام میں نظر آتا ہے اور جس کی بلندی ایک سو بیس گز ہوتی ہے اور کوئی لکھے گا کہ ان کا ایک کان اوڑھنا ہے اور دوسرا بچھونا۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہیں پائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلانے لگیں گے۔ یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں الجھ جائیں گے۔

یہ سات بڑے بڑے عیوب و اقسام جو میں نے گنائے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ موجودہ تفسیروں میں سے شاید ہی کوئی تفسیر ان سے خالی ہو۔ ان کے علاوہ اگر ان تفاسیر کی چھوٹی چھوٹی جزئی خرابیوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ حدِ شمار سے باہر ہیں۔

قرآن یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ قرآن کامل اور مکمل کتاب اور دین کا مستقل دستور العمل ہے۔ وہ اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اللہ نے اس کو نورِ مبین کہا ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ (۴/۱۷۴)

اور ہم نے جگمگاتا نور تمہاری طرف اتارا۔

---

[1] تذکرۃ المفسرات صفحہ ۸۷ [2] تفسیر جامع البیان

نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور اردگرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے کہ وہ واضح کھلا ہوا اور روشن ہے اور اپنے مطالب کی تشریح آپ کرتا ہے اس کی تلاش کے لئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں جیسے آفتاب کو چراغ سے نہیں ڈھونڈا جاتا۔ وہ دین و دنیا کے ان تمام حقائق کی جن سے انسان کو ہدایت ملتی ہے اور قدیمی آسمانی کتابوں کی تمام ابدی تعلیمات کی توضیح اور تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿۱۶/۸۹﴾

اور ہم نے تجھ پہ کتاب اتاری جو ہر شے کی تشریح اور مسلمانوں کے لئے ہدایت رحمت اور بشارت ہے۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۲/۱۱۱﴾

یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔

وَمَا كَانَ هَٰذَا الْقُرْآنُ أَن يُفْتَرَىٰ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰/۳۷﴾

اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کو بنا لے بلکہ یہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے اس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

آیت بالا میں "الکتاب" سے مراد علمِ الٰہی ہے جس کو قرآن نے جا بجا اسی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ ﴿۲۲/۷۰﴾

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ان سب چیزوں کا علم رکھتا ہے جو آسمان و زمین میں ہیں یہ سب وہ لکھی ہوئی ہیں اس علم کو "کتابِ مبین" فرمایا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿۶/۵۹﴾

وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کا علم رکھتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ ہے اور جو خشک و تر ہے وہ سب کتاب مبین (علمِ الٰہی) میں ہے۔

اسی "کتابِ مبین" کو اللہ نے عربی قرآن بنایا۔

وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴿۴۳/۲-۴﴾

اور کتابِ مبین شاہد ہے کہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا تاکہ تم سمجھو، اور وہ ہمارے پاس امّ الکتاب میں بڑے رتبہ والا حکمت والا ہے۔

کتابِ مبین صحیفۂ فطرت ہے اور امّ الکتاب جو کتاب مبین پہ شامل ہے صحیفۂ کائنات ہے جس کا دوسرا نام لوحِ محفوظ

ہے علمِ فطرت فعلِ الٰہی ہے۔ کتاب مبین علمِ الٰہی ہے اور قرآنِ کریم قولِ الٰہی ہے اور یہ تینوں متحد ہیں۔

جس طرح محیطِ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے اسی طرح قرآنی حقائق کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے اور انسانی نسلیں ابدالآباد تک بھی ان کو ختم نہیں کر سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیشہ کے لئے بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔ مزید توضیح کے لئے یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مصنوعاتِ فطرت اور مصنوعاتِ انسانی میں اس قدر بدیہی فرق ہے کہ ہر انسان بلا کسی قسم کے ریب اور شک کے ان دونوں میں امتیاز کر لیتا ہے۔ مثلاً زمین۔ دریا۔ اور پہاڑ اور جنگل کو دیکھ کر سب کو یقین کے ساتھ علم ہو جاتا ہے کہ یہ فطری چیزیں ہیں۔ اور اگر زمین پہ کوئی عمارت یا پہاڑ میں کوئی بت یا دریا میں کوئی کشتی یا جنگل میں کوئی گاڑی نظر آئے تو ہر شخص بلا کسی اشتباہ کے سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی ساخت ہے۔

درخت پر سے گرا ہوا پتہ۔ گھاس میں سے جھڑا ہوا ایک تنکہ۔ چیونٹی کا ٹوٹا ہوا ایک پاؤں اور بھڑ کا گرا ہوا ایک بال اگر سارے عالم کے ماہر اور کاریگر جمع ہو کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ یہی فرق اللہ کے کلام اور انسان کے کلام میں ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (۱۷/۸۸)

کہدے کہ اگر سارے جن و انس اس بات پر متفق ہوں کہ قرآن جیسا کلام بنائیں تو بھی ویسا نہیں بنا سکتے اگرچہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔

لیکن معنوی حقائق چونکہ عقلی چیزیں ہیں اس لئے یہ فرق سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور یہی امتیاز قرآن کا وہ زندہ معجزہ ہے جو جاودانی ہے اور اہلِ بصیرت پر سورج کی طرح نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے آیاتِ الٰہی کا اقوالِ انسانی کے سامنے موازنہ کر کے اس کے اعجاز دکھانے کی کوشش کی ہے اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کس بے بصری میں مبتلا تھے۔

دوسرا فرق مصنوعاتِ فطرت اور مصنوعاتِ انسانی میں یہ ہے کہ فطرتی اشیاء کے منافع اور تاثیرات کی کوئی حد نہیں معین کی جا سکتی۔ بلکہ ان کے متعلق جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہیں اس قدر ان کے افعال و خواص معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ بخلاف انسانی مصنوعات کے جو ایک معین اور مخصوص غرض و غایت کے لئے بنائی جاتی ہیں اور ان سے وہی نفع لیا جاتا ہے جس کو پہلے سے مدنظر رکھ کر وہ بنائی گئی ہیں یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے وہ کسی ایک ماحول۔ ایک زمان یا ایک مکان کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر ماحول ہر زمان اور ہر مکان کے لئے ہے۔ حقائقِ فطرت کے متعلق جس قدر انسان کا علم بڑھتا جائے گا اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائیں گے۔ اور قرآن بھی فطرتی اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا اور تھک جانے والا نہیں ہے۔ بخلافِ انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں اور ان کی غرض معین۔

جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ عہدِ صحابہؓ میں قرآن بالکل سمجھ لیا گیا اور اب ہم کو انہی کے فہم پہ قناعت کر

لینا چاہیئے۔ وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا علمِ قرآنی اس لحاظ سے افضل ہے کہ انہوں نے اس کے عملی پہلو کو اختیار کیا اور جو کچھ سمجھا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھایا اس کی پوری تعمیل کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف نظری کتاب نہیں ہے بلکہ عملی بھی ہے اور اس کی ہدایتوں پر عمل کرنے ہی سے فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے صحابہؓ کا درجہ عملی لحاظ سے اس قدر افضل ہوا کہ ساری اُمت مل کر بھی ان کے رُتبہ کو نہیں پہنچ سکتی جو لوگ فہمِ قرآن کو ان روایات میں الجھاتا چاہتے ہیں جو صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن کسی مخصوص ماحول کی کتاب نہیں ہے اگر کسی ایک زمانہ میں وہ بالکل سمجھ لی گئی تو ختم ہو چکی اور آئندہ کے لئے نصاب نہیں رہی۔ لیکن وہ قیامت تک کے لئے دینی نصاب ہے اور ہر زمانہ میں نئی روشنی اس سے نکالی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے یہ روایات جن ذرائع سے آئی ہیں وہ اس قدر غیر یقینی اور مشتبہ ہیں کہ قرآن جیسی قطعی اور یقینی چیز کی تشریح کا مدار ان کے اوپر رکھنا اس کی قطعیت کو کھوتا ہے۔

یہ خیال بھی کہ اس زمانہ میں جب آیات نازل ہوئی تھیں لوگ ان کے شانِ نزول سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اچھی طرح ان کو سمجھ لیا دراصل قرآن کے متعلق اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک ہی زمانہ کی چیز ہے۔ قرآن کسی شانِ نزول، موقعِ نزول یا واقعۂ نزول کا پابند نہیں ہے۔ اور اس کی ہدایات مخصوص زمان و مکان سے قطعاً وابستہ نہیں ہیں بلکہ بالاتر ہیں۔ ہماری تمام تفسیریں آغازِ عہد سے اب تک یعنی امام ابن جریر طبری سے مفتی محمد عبدہٗ تک اسی قدامت پرستی کے نظریہ کے ماتحت لکھی گئی ہیں اور ان کا انداز بھی شروع سے لے کر آج تک ایک ہی ہے۔ یعنی وہ سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اس طرح آیات و الفاظ کی تشریح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآنی مسائل اور حقائق سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ کیونکہ وہ مسلسل نہیں بیان کئے گئے ہیں۔ بلکہ مختلف سورتوں اور آیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے قرآن فہمی کے لئے یہ تفسیریں زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ ان تمام تفسیروں کا مفید حصہ جو ہو سکتا ہے وہ تقریباً اسی قدر ہے جس کو راغب اصفہانی نے اپنی کتاب المفردات میں جمع کر دیا ہے۔ بقیہ جو کچھ ہے وہ سلف کی آیات فہمی کی تاریخ ہے اور بس۔ اس میں سے ہم صرف اسی قدر لے سکتے ہیں جو قرآنی تشریح کے مطابق نکل آئے۔

اصولِ قرآن

اب ہم خود قرآنِ کریم ہی سے فہمِ قرآن کے وہ اصول بیان کرتے ہیں جو ہم نے اس سے اخذ کئے ہیں کیونکہ قرآن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں مستقل کتاب ہے۔ جو اپنی کسی بات میں بھی دوسری کسی چیز کی محتاج نہیں ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)

اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

(۱)

قرآن فہمی کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی جس حقیقت کی تفصیل مطلوب ہو وہ قرآن ہی سے نکالی جائے کیونکہ قرآن کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۹)

پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ آیاتِ قرآنی بیشتر محکمات ہیں یعنی ان کے معانی قطعی اور متعین ہیں۔ تھوڑی سی متشابہات ہیں جن کے حقائق انسان کی علمی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات۔ صفات۔ جنت دوزخ، اور میزانِ عمل وغیرہ جن کو تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قرآن میں بیان کیا گیا ہے اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔ ان کے اوپر صرف ایمان کا مطالبہ ہے نہ کہ عمل کا۔ اس وجہ سے ان کی تفصیل مطلوب نہیں ہے البتہ محکم آیات جوامع الکتاب اور اصل قرآن کہی گئی ہیں ان کی تفصیلات اللہ ہی کی طرف سے کی گئی ہیں۔

کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝ (۱۱/۱)

یہ (مکمل) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

یہ تفصیل علم کے ساتھ کی گئی ہے:-

وَلَقَدْ جِئْنٰھُمْ بِکِتٰبٍ فَصَّلْنٰہُ عَلٰی عِلْمٍ (۷/۵۲)

ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے۔

یہ تفصیل اہلِ علم و فہم کے لئے ہے:-

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ (۶/۹۷)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَھُوْنَ ۝ (۶/۹۹)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو فہم رکھتے ہیں۔

جس قدر انسان کا علم حقائقِ فطرت کے متعلق بڑھتا جائے گا اسی قدر وہ قرآنی تفصیلات زیادہ سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اگر فہمِ معانی میں اختلافات واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ جس طرح کہ امورِ فطرت کے محققین میں کبھی کبھی نظریوں کا اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ لیکن مزید غور و فکر سے رفتہ رفتہ آخرکار وہ مٹ جاتا ہے اور سب کے سب ایک حقیقت پر پہنچ کر متحد الخیال ہو جاتے ہیں۔

قرآنی آیات جو اکثر بہ تبدیلِ الفاظ و عبارات جا بجا الٹ پھیر کے بیان کی گئی ہیں ان میں ان کی تشریح مضمر ہے۔

وَکَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَہٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ (۶/۱۰۵)

اور اسی طرح ہم آیتوں کو پھیر پھیر کے لاتے ہیں تاکہ وہ کہدیں کہ تو نے پڑھ کر سنا دیا اور ہم اہلِ علم کے لئے تشریح کر دیں۔

الغرض قرآن کریم کی تفصیل خود قرآن ہی میں ہے اور وہ مفصل کتاب ہے۔

وَھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ۝ (۶/۱۱۴)

اور وہی اللہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ۔

اس لئے تفسیر قرآنی کی صورت یہ ہے کہ جس طرح حقائقِ فطرت کے مفکرین اپنی علمی تحقیق کے لئے ایک خاص شعبہ کو جس میں ان کو مہارت ہوتی ہے مخصوص کر لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو علوم صحیحہ میں سے کسی علم کے ماہر ہوں قرآن کی ان مخصوص آیات کی تفصیل جو ان کے علم سے تعلق رکھتی ہیں اپنے ذمہ لیں اور ان پر علم و بصیرت کے ساتھ غور و فکر کریں۔ اس طرح پر قرآن کریم کی تفصیل ہوتی جائے گی اور عالمِ فطرت کی طرح اس کے حقائق بھی آشکارا ہوتے جائیں گے۔ لیکن علم کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

بے شک قرآن سے نصیحت لینا اور اس پر عمل کرنا عوام کے لئے بھی سہل ہے جس طرح کہ عالمِ فطرت کی نعمتوں سے متمتع ہونا جاہلوں کے لئے بھی آسان ہے۔ مگر عالمِ فطرت پر غور کرنے والوں نے ہزارہا چیزیں جو ایجاد کی ہیں وہ ان کے فہم سے بالاتر ہیں اسی طرح قرآنی حکمت تک رسائی علومِ صحیحہ کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔

اس سے یہ امر واضح ہو گیا کہ قرآن کی موجودہ تفسیریں جو آج تک ہوئی ہیں ان سے آیات کے معانی حل ہوئے ہیں اور یہ ضروری اور ابتدائی چیز ہے لیکن کسی قرآنی حقیقت کی توضیح کے لئے سارے قرآن کو چھاننا پڑے گا اور اس لحاظ سے ابھی تک قرآن پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

(۲)

آیات کی تشریح میں روایات سے مدد لی جا سکتی ہے لیکن چونکہ روایات غیر یقینی اور ظنی[1] ہیں اس لئے ان پر تفسیر کا مدار نہیں رکھا جا سکتا۔ تاریخ تفسیر میں ہم امام احمد بن حنبل کا قول نقل کر چکے ہیں کہ "تفسیری روایتیں بوجہ ضعفِ رُواۃ کے بے اصل ہیں"۔ عام خیال یہ ہے کہ صحاح ستہ میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں لیکن ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی امام موصوف کے قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ چنانچہ تفسیر بالروایت کے نام سے ہم نے ایک مقالہ[2] میں صحاح ستہ سے بہت سی مثالیں نکال کر پیش کر دی ہیں جو علم، عقل اور قرآن کے خلاف ہیں اور ہرگز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی تفسیریں نہیں ہو سکتیں۔

(۳)

تفسیر بالروایت کی ایک شاخ اختلافِ قرأت بھی ہے۔ یعنی مفسروں نے بعض آیات کے الفاظ میں شاذ قراءتوں سے اضافے کر لئے ہیں۔ مثلاً

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهٗ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ (۴/۱۲)

---

[1] روایات کے ظنی اور غیر یقینی ہونے کا پورا پورا ثبوت ہم اپنے مقالہ "علمِ حدیث" میں دے چکے ہیں جو ادارہ طلوعِ اسلام سے شائع کیا جا چکا ہے۔ ("مقامِ حدیث" میں۔ طلوعِ اسلام)

[2] یہ مقالہ جداگانہ رسالہ البیان امرتسر سے شائع ہو چکا ہے۔ (یہ بھی "مقامِ حدیث" میں شامل ہے۔ طلوعِ اسلام)

یہاں اخ اور اخت کے الفاظ کو جو بلا قید بیان کئے گئے ہیں اخیافی بھائی بہن کے لئے مخصوص کیا گیا اس روایت کی بنیاد پر کہ بعض صحابہ کی قراءت میں "اَخٌ اَوْ اُخْتٌ لِاُمٍّ" مروی ہے اس وجہ سے فقہاء نے اخیافی بھائی بہن کو ذوی الفروض میں داخل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وراثت کے اصول ہی میں بڑی غلطیاں واقع ہو گئیں اور اخیافی بھائی بہنوں کی وجہ سے بعض صورتوں میں حقیقی بھائی بہن محروم ہونے لگے۔ مثلاً

ہندہ مسئلہ

شوہر	ماں	دو اخیافی بھائی	دو حقیقی بھائی
۳	۱	۲	محروم

یہ کیسے عقل جائز رکھ سکتی ہے کہ ماں اور باپ دونوں کی اولاد یعنی سگے بھائی تو محروم رہیں اور صرف ماں کی اولاد ترکہ لے لے جن کو ممکن ہے کہ غیر خاندان سے وہ لائی ہو۔ کیا یہ کھلی ہوئی غلطی نہیں ہے جو قرآن کریم کے سر تھوپی جا رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت مذکورۂ بالا میں قرآن نے بہن اور بھائی کا حصہ ہی نہیں بیان کیا ہے۔ بلکہ رَجُلٌ وَّ امْرَاَۃٌ یعنی مذکر و مؤنث عصبی وارثوں کا حصہ ہے۔ اس مسئلہ کو ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی عربی کتاب الوراثۃ فی الاسلام میں بیان کر دیا ہے جو جامعہ ملیہ کے مطبع سے شائع ہو چکی ہے[1]۔ اس لئے شاذ قراءتیں قرآن میں اضافے ہیں جو کسی طرح تسلیم کے قابل نہیں کیونکہ قرآن کی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے اور وہ اس کے ایک ایک لفظ کا محافظ ہے۔ ہمارا ایمان اسی قرآن پر ہے جو بین الدفتین محفوظ ہے۔

(۴)

قرآن کریم کے الفاظ جس حد تک لے چلیں اس سے آگے مطلق قدم نہ بڑھایا جائے۔ کیونکہ قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اپنے معنی کے لحاظ سے کامل اور مقصود کے مطابق ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۱۱۶/۶)

اور تیرے رب کے الفاظ سچائی اور (معنی کی) برابری کے لحاظ سے پورے ہیں۔

ان کلمات سے آگے بڑھنے میں قرآنی حدود سے تجاوز لازمی ہے جو بڑی غلطیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ مثلاً

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ (۱۵/۲۴-۲۵)

ہم کو تم میں سے آگے جانے والوں کا بھی علم ہے۔ اور پیچھے آنے والوں کا بھی علم ہے۔ بیشک تیرا رب ان کو حشر میں جمع کریگا۔

مستقدم اور مستاخر کے الفاظ قرآن میں کئی جگہ پہلے اور پیچھے مرنے والوں کے لئے مستعمل ہوئے ہیں۔ مثلاً

اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (۱۶/۶۱)

جب ان کی اجل آجائے گی تو ایک گھڑی نہ وہ پیچھے رہیں گے، نہ آگے بڑھیں گے۔

[1] اس موضوع پر علامہ مرحوم کا مقالہ طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ (طلوع اسلام)

یعنی اپنے وقتِ معینہ پر ان کی ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ اس لئے قرآن کی تفصیل کے مطابق "ولقد علمنا المستقدمین" کے معنی یہ ہوئے کہ تم میں سے جو لوگ پہلے گزر گئے اور جو بعد میں مریں گے ان سب کا ہم علم رکھتے ہیں اور حشر کے دن ان سب کو جمع کریں گے۔ لیکن بعضوں نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایک حسین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نمازِ جماعت پڑھنے کے لئے مسجد میں آیا کرتی تھی کچھ لوگ آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اس کو نہ دیکھیں اور کچھ پیچھے کی صف میں رہ جاتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل میں سے اس کی طرف جھانکتے تھے۔ انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اب یہ معنی نکالنے کے لئے آیت میں پہلی صف اور پچھلی صف کے الفاظ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جو اصولاً جائز نہیں۔ اور پھر صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت پر ایسا مکروہ الزام عائد ہوتا ہے جس کو کوئی شخص جو ان کے حالات سے واقف ہے تسلیم نہیں کر سکتا اگرچہ یہ روایت صحاح ستہ کی تین کتابوں ترمذی۔ نسائی اور ابنِ ماجہ میں درج ہے لیکن خود قرآنی تفصیل کی مخالف ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۵)

جہاں تک زبان کا تعلق ہے قرآن کی عربی آسان اور واضح ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں :-

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ (۲۶/۱۹۵)

واضح عربی زبان میں۔

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ (۳۹/۲۸)

عربی قرآن جس میں کوئی کجی نہیں۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ (۴۴/۵۸)

ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے۔

لہٰذا، قرآن کے معنی وہی لئے جائیں گے جو عربی زبان کے مطابق صحیح ہوں۔ اہلِ لغت نے جو معانی الفاظ کے لکھے ہیں ان کی بنیاد سماع پر ہے۔ اور کتبِ لغت کی تدوین جس وقت ہوئی ہے اس وقت تک بہت سے الفاظ کے معانی نظیر، حدیث و فقہ میں رائج ہو چکے تھے وہی لغات میں درج ہوئے۔ اس لئے لغت مسلّم ہے مگر وہ حتمی دلیل نہیں ہے۔ قرآنی الفاظ کے معانی میں اگر اختلاف واقع ہو تو خود قرآن سے ان کا تعین ہو سکتا ہے۔

اصول و قواعد لسانی کی ترتیب بھی نزولِ قرآن کے مدتوں بعد ہوئی ہے۔ بلکہ ان کا بڑا حصہ ائمہ فن نے خود قرآن ہی سے استنباط کیا ہے۔ لہٰذا، یہ اصول قرآن پر حاکم نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی بات قرآن میں ان اصول کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ جن لوگوں نے اصول استنباط کئے ان سے کمی رہ گئی ہے۔

(۶)

ایک اہم اصول قرآن فہمی کا یہ ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے :-

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴/۸۲)

اور اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اس لئے کسی آیت کی تفسیر نہیں کی جا سکتی جو دوسری آیت کے خلاف پڑتی ہو۔ مثلاً :-

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ (۱۰/۱۸)

عام مفسروں نے آیت بالا میں لَا يَعْلَمُ کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف لاعلمی منسوب کی ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے بھی اس کا ترجمہ یہ کیا ہے :-

"اور پوجتے ہیں اللہ کے سوا جو چیز نہ بگاڑ سکے ان کا نہ بھلا کرے اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس تو کہہ کہ تم اللہ کو جتاتے ہو، جو اس کو معلوم نہیں کہیں آسمانوں میں نہ زمینوں میں"

یہ تفسیر یا ترجمہ علاوہ اس کے کہ جسارت ہے جو کسی مسلمان کے لئے زیبا نہیں براہ راست خود قرآنی تصریح کے خلاف ہے۔ قرآن میں ہے :-

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ (۲۹/۴۲)

جس شے کو بھی وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں اللہ اس کو جانتا ہے۔

پھر یہ مشرکین اللہ کو اپنے باطل معبودوں کی خبر ہرگز نہیں دیتے بلکہ ان کے توسط سے خود اپنی حاجتوں کی خبر اللہ تک پہنچانا چاہتے ہیں اور یہی معنی سفارشی بنانے گئے ہیں۔ ورنہ اگر وہ اللہ کو اپنے معبودوں کی خبر دیتے تو خود اپنا حال بھی اس سے کہہ سکتے۔ بیچ میں سفارشی کی کیا ضرورت تھی۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے :-

اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کہ کیا تم اللہ کو ان کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو آسمان اور زمین کی کسی شے کا علم نہیں ہے۔

(۷)

پہلے یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں نسخ کے عقیدہ نے بہت خرابیاں پیدا کی ہیں۔ مفسرین تین قسم کی نسخ کے قائل ہیں

(۱) وہ آیات جن کا حکم بھی منسوخ ہو گیا اور وہ پڑھی لکھی بھی نہیں جاتیں۔

یہ خیال چند نہایت ضعیف بلکہ موضوع روایات سے پیدا ہوا۔ جن کو اکثر ائمہ حدیث خاص کر قاضی ابوبکر نے موضوعات کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اب چونکہ وہ آیتیں موجود نہیں نہ ان کے احکام باقی ہیں اس لئے ان پر بحث بھی غیر ضروری ہے۔

(۲) وہ آیات جن کا حکم نہیں منسوخ ہوا تلاوت منسوخ ہو گئی۔

نسخ کی یہ قسم عقل کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ اگر حقیقت میں کوئی ایسی آیت ہوتی تو ناممکن تھا کہ اللہ اس کی حفاظت نہ کرتا۔ مثال میں آیت رجم پیش کی جاتی ہے۔ حالانکہ اگر واقعی آیت رجم نازل ہوئی ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن میں درج ہونے سے رہ جاتی۔ خود حضرت عمرؓ جن سے یہ روایت کی گئی ہے جمع قرآن میں شریک تھے۔ کیا چیز مانع تھی کہ انہوں نے اس کو نہ لکھوایا۔ علاوہ بریں چونکہ یہ روایت قرآن کی تصریح اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کے خلاف ہے اس لئے ہرگز تسلیم کے قابل نہیں ہے خواہ اس کے راوی جبرئیل و میکائیل ہی کیوں نہ بتائے جائیں۔

(۳) وہ آیات جن کا حکم منسوخ ہوگیا ہے۔ مگر تلاوت منسوخ نہیں ہوئی۔

اس قسمِ سوم میں لوگوں نے رائے اور قیاس کو اس قدر دخل دیا کہ پچاسوں آیتوں پر نسخ کا حکم لگا دیا۔ علامہ ابن العربی نے اس تعداد کو کم کر کے ۲۱ آیتوں کو منسوخ قرار دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان میں ذرا اور غور کیا تو ان کے نزدیک صرف پانچ آیتیں منسوخ ثابت ہوئیں۔ ہمارے نزدیک وہ بھی منسوخ نہیں۔ جیسا کہ ہم نے دلائل کے ساتھ اپنی کتاب تاریخ القرآن میں لکھ دیا ہے جو علی گڑھ سے شائع ہو چکی ہے۔ ان باتوں سے یہ صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ آیات کو جن لوگوں نے منسوخ کہا ہے محض اپنی رائے اور قیاس سے کہا ہے۔ اور اللہ کا کلام اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ کسی انسان کی رائے سے منسوخ ہو سکے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ قرآن کے ایک لفظ کو بھی بدل سکیں۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآئِ نَفْسِىٓ ۚ (۱۰/۱۵)

کہہ دے کہ مجھے حق نہیں ہے کہ اس کو بدلوں اپنی طرف سے،

ان آیات کے متعلق جن کو لوگوں نے منسوخ الحکم قرار دیا ہے ہم کو یہ یقین ہے کہ وہ قرآن کی احکامی آیتیں ہیں اللہ نے ان کو نازل فرمایا ہے اور رسول نے ان کو یاد کرایا اور قرآن میں لکھوایا ہے اب سوائے اللہ کے دوسرا کون ان کو منسوخ کر سکتا ہے اگر کسی کو دو آیتوں میں باہمی تعارض نظر آتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک کو منسوخ قرار دیتا ہے تو یہ اس کی فہم کا قصور ہے کیونکہ قرآن نے تصریح کی ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے۔

قرآن کی آیات میں سے ایک بھی منسوخ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے روایات سے آیات کو منسوخ قرار دیا ہے انہوں نے قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے مثلاً:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا ۖ ٱلْوَصِيَّةُ لِلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ بِٱلْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى ٱلْمُتَّقِينَ ۝ (۲/۱۸۰)

تمہارے اوپر فرض کیا گیا کہ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو والدین اور اقربا کے لئے وصیت کر جائے یہ اللہ سے ڈرنے والوں پر حق ہے۔

صریح الفاظ میں اللہ نے مالداروں پر ورثہ کے لئے وصیت فرض کی اور متقیوں پر اس کو لازمی قرار دے کر مؤکد فرمایا۔ پھر آیتِ وراثت میں بھی تین جگہ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ فرما کر توضیح کر دی کہ توریث کا اجراء وصیت کے نفاذ کے بعد ہوگا۔ مگر فقہا نے "لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ" (یاد رکھو کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے) کی روایت سے اس مؤکد آیت کو منسوخ کر ڈالا اور یہ سمجھ نہ سکے کہ وصیت ورثہ کی شخصی مصلحتوں کے لئے ہے۔ جو توریث میں ممکن نہیں۔ کیونکہ ورثہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک پر اس نے ہزاروں روپیہ خرچ کیا ہے اور اس کو پڑھا لکھا کر اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ خوب کماتا ہے۔ اور باپ کی دولت سے مستغنی ہے۔ دوسرا بیٹا آج پیدا ہوا ہے۔ وراثت کا قانون کلی ہے وہ شخصی مصالح کا لحاظ نہیں کرے گا اور دونوں کو برابر دے گا۔ لیکن مصالح عائلی کا تقاضا اس کے خلاف ہے۔ اس قسم کے مخصوص حالات کے لئے وصیت فرض کی گئی ہے۔ تاکہ مورث اپنے ورثہ کی مناسب ضرورتوں کا لحاظ رکھ سکے۔ ایسی ضروری اور مؤکد آیت

کو لوگوں نے صرف خبرِ احاد کی بناء پر منسوخ کر ڈالا۔ اور قرآن کی رکھی ہوئی مصلحت کو ضائع کر دیا

خاتمہ یہ ہیں وہ چند موٹے موٹے اصول جو ہم نے قرآن سے اخذ کئے ہیں ان کے علاوہ ضرورت پڑنے پر اور بھی اصول نکالے جا سکتے ہیں ان اصول کے مطابق قرآنِ کریم کی تعلیمات کی تشریح عنوانات متعین کر کے ہی کی جا سکتی ہے اور ہم نے اپنا اصول یہی رکھا ہے اس انداز سے سب سے پہلی کتاب جو لکھی گئی وہ میری تصنیف تعلیماتِ قرآن ہے جو دہلی سے شائع کی گئی ہے۔ اس میں صرف چھ مسائل کی توضیح ہے جو اصولِ اسلام اور عقائد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب میرے مخلص رفیق چودھری غلام احمد خاں پرویز بی اے۔ جن کو اللہ نے قرآن فہمی کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اسی نہج پر اپنی کتاب معارف القرآن پیش کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ناظرین کے لئے نہ صرف یہ کہ یہ کتاب مفید ثابت ہوگی بلکہ ان کے اوپر اس حقیقت کو بھی واضح کر دے گی کہ قرآنی حقائق کو قرآن ہی سے سمجھنے کا طریقہ محفوظ اور صحیح ہے اور ان کے دل کو اطمینان بخشے گی کہ جو کچھ انہوں نے سمجھا وہ قرآن ہی کی تعلیم ہے نہ کہ انسانی خیالات۔ کیونکہ کسی خاص خیال کو لے کر قرآن میں گھسنا اور اس کی آیات کو اس کے مطابق موڑنا خالص الحاد ہے جس کی سزا جہنم ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۗ أَفَمَن يُلْقَىٰ فِي النَّارِ خَيْرٌ أَم مَّن يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ (۴۱/۴۰)

جو لوگ ہماری آیتوں میں کجی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا جو آگ میں ڈالا جائے بہتر ہے یا جو قیامت کے دن بے خوف ہو کر آئے۔

اس کتاب کی مزید کیفیت آپ کو خود چودھری صاحب موصوف کے تعارف سے معلوم ہو گی۔ انہوں نے جس محنت اور خلوص سے اس کو لکھا ہے اس سے مجھے امید ہے کہ اللہ ان کی کوشش کو مقبول اور ان کی سعی کو مشکور فرمائے گا۔ آمین

محمد اسلم۔ جیراجپوری

۱۰، اپریل ۱۹۴۱ء۔ جامعہ نگر۔ دہلی

نظامِ ربوبیت

شائع ہو گئی

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں اور ان کے برعکس (۲) اسلام کا معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے —— اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی

★ کتاب آفسٹ کی چھپائی میں ولائتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے —— ضخامت تقریباً چار سو صفحات —— سنہری جلد —— قیمت فی جلد پچاس روپے محصول ڈاک ۵/-

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور —— مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

باب المراسلات

۱- حقِ وراثت

حلقہ قارئین طلوعِ اسلام کے ایک دیرینہ کرم فرما اپنی ایک اُلجھن کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں اور مناسب سمجھتے ہیں کہ اسے طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے تاکہ ان جیسے اور احباب بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ ان کی اُلجھن یہ ہے:-

میں ایک متوسط حال شخص ہوں۔ میں نے اپنی محنت سے تھوڑی سی جائیداد بنائی ہے۔ میرا ایک بیٹا ہے جسے میں نے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ اب اپنی ملازمت میں خوشحال ہے۔ میری اور کوئی ذمہ داری نہیں۔ لیکن میرے پیشِ نظر بعض ایسے مفلوک الحال افراد ہیں جو میری امداد کے صحیح معنوں میں مستحق ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کا ایسا انتظام کر دوں کہ یہ ان مستحقین کو مل جائے۔ لیکن میرا بیٹا کہتا ہے کہ مجھے ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں کیونکہ وہ اس کا شرعاً وارث ہے۔ کیا آپ فرمائیں گے کہ وہ کہاں تک صحیح کہتا ہے اور قرآنِ مجید کی رو سے صورت کیا ہے؟

طلوعِ اسلام

آپ کا صاحبزادہ غلطی پر ہے۔ آپ اپنی جائیداد کے مالک ہیں تو آپ کو اپنی زندگی میں اس پر کلی اختیار حاصل ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کا وارث اس جائیداد کا مالک بنے گا جسے آپ چھوڑ کر فوت ہوں گے۔ اور وہ قانونِ وراثت کی رو سے اس کے حصے میں آئے گی۔ قرآن کریم کی رو سے قانونِ وراثت کا اطلاق مَا تَرَكَ (۴/۱۱) پر ہوتا ہے۔ یعنی اس پر جسے مورث (مرنے والا) چھوڑ کر مرے۔ اگر وہ اپنی کل املاک کا تصفیہ اپنی زندگی ہی میں کر دے اور اس طرح کچھ بھی چھوڑ کر نہ مرے، تو اس کے ورثا کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ لہٰذا، مورث کی زندگی میں اس کے اقرباء اس بناء پر اس کی جائیداد میں اپنا حق نہیں جتا سکتے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اس کے وارث بنیں گے۔ پھر ستم یہ ہے کہ وہ صرف اس جائیداد کے وارث بنیں گے جسے وہ چھوڑ کر مرے۔ اس کی زندگی میں اس کی جائیداد پر انہیں کسی قسم کا حق یا اختیار نہیں ہوگا۔

قرآن مجید نے ایسی اُلجھنوں کے حل کے لئے وصیت کا حکم دیا تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ مالک کو جس طرح اپنی زندگی میں اپنی ملکیت پر کلی اختیار ہوتا ہے اسی طرح اسے مرنے کے بعد بھی اپنی صوابدید کے مطابق اس کی تقسیم کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس کے اقرباء جس طرح اس کی زندگی میں اس کے حقِ ملکیت میں دخیل نہیں ہو سکتے اسی طرح اس کی وفات کے بعد بھی ان کا کوئی حق مسلّم نہیں ہوتا بجز اس کے جو وصیت پوری

کرنے کے بعد، ان کے حصے میں آتے ہیں۔ اگر وصیت پوری کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا تو انہیں کچھ نہیں ملے گا۔ بنا بریں قرآنِ کریم کی رُو سے کوئی اُلجھن پیدا ہی نہیں ہو سکتی ــــــ نہ کسی کی زندگی میں، نہ اس کی وفات کے بعد۔ یہ اُلجھنیں ہمارے مروجہ قانونِ وصیت کی رُو سے پیدا ہوتی ہیں، جس کے مطابق کوئی شخص اپنی املاک کے ایک تہائی سے زیادہ کے لئے وصیت نہیں کر سکتا۔ اور وہ بھی ورثا کے حق میں نہیں۔ یہ قانون صریحاً قرآن کریم کے خلاف ہے لیکن اس کے باوجود یہ "اسلامی قانونِ شریعت" کی حیثیت سے نافذ ہے۔ طلوع اسلام برسوں سے اس کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے لیکن کوئی سنتا ہی نہیں۔

بہر حال آپ کی اُلجھن کا حل یہ ہے کہ آپ کو اپنی جائداد کا کُلی اختیار حاصل ہے اور آپ کا کوئی وارث آپ کی زندگی میں اس میں دخیل نہیں ہو سکتا۔

اور اس قسم کی تمام الجھنوں کا حقیقی حل قرآن کے معاشی نظام میں ہے جو سردست تو عالم تصور ہی میں ہے۔

۲۔ نماز پڑھنی چھوڑ دی!

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ان کا ایک دوست نماز کا پابند تھا لیکن اب اس نے یہ کہہ کر نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے کہ جب یہ نماز اس بگڑے ہوئے معاشرہ میں کسی قسم کی اصلاح ہی نہیں کر سکتی تو اس کے پڑھتے رہنے سے حاصل کیا ہے؟

طلوع اسلام

آپ کے دوست کے دل میں جو خیالات ابھر رہے ہیں وہ ان میں منفرد نہیں۔ ہمارے پاس اکثر نوجوان یہی کچھ کہتے ہوئے آتے ہیں۔ لیکن اس باب میں ہمارا مسلک ــــــ جسے ہم شروع سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں ــــــ یہ ہے کہ اُمت ان شعائر (نماز۔ روزہ وغیرہ) کو جس طرح ادا کرتی چلی آرہی ہے ہمیں اس کا ساتھ دینا اور ان شعائر کو قائم رکھنا چاہیئے۔ نہ انہیں چھوڑنا چاہیئے اور نہ ہی ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنی چاہیئے۔ ان کا اور کوئی فائدہ نہ بھی سمجھ میں آئے تو کم از کم یہ ہمارے ملّی تشخص کی علامات تو ہیں۔ اور ملت ہماری (جیسی بھی یہ ہے) اس کا تسلسل ضروری ہے۔ اس لئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ   پیوستہ رہ شجر سے، اُمید بہار رکھ

بلکہ اس سے بھی زیادہ دلسوز انداز سے کہ

کہن شاخے کہ زیر سایۂ او پرورش کردی   چو برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

آپ کے اس دوست نے اپنا نام بھی تو مسلمانوں جیسا رکھ چھوڑا ہے۔ یہ اسی لئے ہے نا کہ ملت کے ساتھ ان کا رابطہ قائم رہے اور وہ اس کے ایک فرد سمجھے جائیں۔ ورنہ اگر وہ اپنا نام (مثلاً) رام داس رکھ لیں تو اس سے ملت کے ساتھ ان کا رابطہ کٹ جائے گا۔ اور ان کا شمار غیر مسلم اقلیتوں میں ہو جائے گا۔ اسلامی شعائر کے ساتھ وابستگی کو انہیں ادکم از کم اتنی اہمیت تو دینی چاہیئے۔

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۱۶ مئی تا ۱۶ جون سنہ ۱۹۸۰ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۱۔ بیگم حلیم خاں صاحبہ معرفت بزم طلوع اسلام۔ لاہور	۵۰/- روپے	۳۲۲۳
۲۔ عنایت اللہ صاحب۔ دیپال گڑھ دیبق۔ ضلع دیبق	۱۰۰/-	۳۲۲۴
۳۔ سکینہ روحی صاحبہ معرفت صوفی محمد نذیر احمد صاحب کویت	۱۸۱۱/-	۳۲۲۵
۴۔ صوفی محمد [illegible] صاحب معرفت بزم طلوع اسلام [illegible] جہلم	۱۵۰/-	۳۲۲۶
۵۔ راجہ حبیب احمد صاحب " " " "	۳۰/-	۳۲۲۷
۶۔ شاہدہ بیگم صاحبہ " " " "	۱۰/-	۳۲۲۸
۷۔ قمر النساء صاحبہ " " " "	۱۰/-	۳۲۲۹
۸۔ فضل ربی خاں صاحب۔ نمائیگے۔ سوات	۱۰۰/-	
۹۔ ماسٹر یاور خاں صاحب۔ قریہ فتح پور۔ سوات	۵۰/-	۳۲۳۰
۱۰۔ مولوی عبدالحلیم فکری صاحب۔ تنگوڑ۔ زیارت	۳۰/-	
۱۱۔ حکیم دولت مند صاحب۔ فتح پور۔ سوات	۱۰۰/-	
۱۲۔ عبدالمجید حقانی صاحب۔ بنوں	۱۰۰/-	۳۲۳۱
۱۳۔ سید محتاج الدین کاکاخیل صاحب۔ سرڈھیری۔ مردان	۳۰۰/-	۳۲۳۲
۱۴۔ مسٹر اے۔ خاں صاحب معرفت مسز آر۔ خاں صاحبہ۔ بحرین	۲۵۸/-	۳۲۳۳
۱۵۔ ایم اشفاق احمد صاحب۔ لنڈن معرفت بزم طلوع اسلام لنڈن	۶۷/۳۲	۳۲۳۴
۱۶۔ ایم جبار صاحب " " " "	۴۴/۸۸	۳۲۳۵
۱۷۔ ایم۔ صابر صاحب " " " "	۴۴/۸۸	۳۲۳۶
۱۸۔ چوہدری احمد علی صاحب۔ ایڈنبرا " " "	۲,۸۰۶/-	۳۲۳۷
۱۹۔ چوہدری محمد صدیق صاحب۔ ایرڈرائی " " "	۴۴۸/۸۰	۳۲۳۸
۲۰۔ چوہدری ایم اسلم صاحب۔ ایڈنبرا " " "	۴۴۸/۸۰	۳۲۳۹
۲۱۔ رانا محمد ناصر صاحب۔ سٹین ہل سٹیفنز " " "	۲۲۴/۴۰	۳۲۴۰
۲۲۔ محمد شفیع صاحب۔ ہونسلو " " "	۵۶۱/-	۳۲۴۱
۲۳۔ چوہدری ایم منیر احمد صاحب ہونسلو " " "	۱۱۲۳/-	۳۲۴۲

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۲۴۔ ایم۔ اے۔ جوش صاحب۔ لندن معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۱۱۲/- روپے	۳۲۴۳
۲۵۔ ایم۔ ریاض صاحب " " " " "	۴۴/۸۸	۳۲۴۴
۲۶۔ علی اختر صاحب " " " " "	۳۳۶/۶۰	۳۲۴۵
۲۷۔ مقبول محمود صاحب " " " " "	۱۱۲/۲۴	۳۲۴۶
۲۸۔ حکیم قمر الزماں صاحب۔ بزم طلوع اسلام [illegible]	۱۰۰۰/-	۳۲۴۷
۲۹۔ بیگم چوہدری عبدالکریم صاحب۔ ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۲۴۸
۳۰۔ چوہدری محمد صادق صاحب۔ ماڈل ٹاؤن۔ گوجرانوالہ معرفت چوہدری مقبول شوکت صاحب	۵۰۰۰/-	۳۲۴۹
۳۱۔ محمد بشارت صاحب چارہان۔ مری	۲۵/-	۳۲۵۰
۳۲۔ ملک عتیق وجدانی صاحب۔ مری	۵۰/-	۳۲۵۱
۳۳۔ نام کی اشاعت نہیں چاہتے (اسلام آباد)	۲۰۰/-	۳۲۵۲
۳۴۔ میر افضل خاں صاحب۔ [illegible]۔ آزاد کشمیر	۱۰۰/-	۳۲۵۳
۳۵۔ میاں عبدالرشید و میاں احمد زیب صاحب۔ منگورہ سوات	۲۰/-	۳۲۵۴
۳۶۔ مسز رشیدہ عنایت صاحبہ۔ لاہور	۲۰۰/-	۳۲۵۵
۳۷۔ نام اور پتہ ظاہر نہیں کیا (لاہور)	۵۰/-	۳۲۵۶
۳۸۔ مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۲۵۷
۳۹۔ آر۔ ایم۔ نواز صاحب۔ برمنگھم	۳۲۵/-	۳۲۵۸
۴۰۔ محمد صدیق صاحب۔ لاہور معرفت بزم طلوع اسلام۔ لاہور	۱۰۰/-	۳۲۵۹
۴۱۔ خوشی محمد اختر صاحب " " " " "	۴۰/-	۳۲۶۰
۴۲۔ ڈاکٹر محمد صدیق صاحب۔ کراچی	۲۰۰/-	۳۲۶۱
۴۳۔ شفیق خالد صاحب۔ بحرین	۲۵۰/-	۳۲۶۲
۴۴۔ [illegible] صاحب بیگم [illegible] بزم طلوع اسلام [illegible]	۱۱۲/۴۲	۳۲۶۳
۴۵۔ [illegible] صاحب " " " "	۱۱۲/۴۲	۳۲۶۴
۴۶۔ [illegible] صاحب " "	۱۱۲/۴۲	۳۲۶۵
۴۷۔ محمد اسلم [illegible] صاحب " " "	۱۱۲/۴۲	۳۲۶۶

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۴۸۔ شبیر احمد خان صاحب۔ خلیفہ۔ معتمد بزمِ طلوعِ اسلام۔ لندن بذریعہ محمد ابراہیم صاحب	۱۱۴/۷۲ روپے	۳۲۶۷
۴۹۔ محمد لطیف صاحب۔ " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۶۸
۵۰۔ محمد اکبر خان صاحب۔ " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۶۹
۵۱۔ اختر عثمان صاحب۔ برمنگھم " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۰
۵۲۔ محمد سلیم خان صاحب۔ " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۱
۵۳۔ عبدالوحید خان صاحب " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۲
۵۴۔ ایم۔ مشتاق صاحب۔ کیتھلی " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۳
۵۵۔ ایم۔ خالق صاحب۔ " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۴
۵۶۔ محمد سلیم صاحب۔ " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۵
۵۷۔ چوہدری ایم۔ افسر صاحب۔ " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۶
۵۸۔ ایم۔ اقبال خان صاحب۔ " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۷
۵۹۔ ناصر احمد صاحب۔ " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۸
۶۰۔ محمد علی صاحب۔ " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۷۹
۶۱۔ محمد گوہر خان صاحب۔ برمنگھم " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۸۰
۶۲۔ میجر ایم۔ اکرم خان صاحب کرانہ " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۸۱
۶۳۔ ایم۔ امتیاز خان صاحب۔ ڈڈلی " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۸۲

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۶۴۔ ایم۔ نذیر بٹ صاحب۔ برمنگھم بذریعہ معتمد بزمِ طلوعِ اسلام۔ لندن بذریعہ محمد اکبر خان صاحب	۱۱۴/۷۲	۳۲۸۳
۶۵۔ محمد اسحاق خان صاحب۔ نوٹنگھم " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۸۴
۶۶۔ محمد سلیم خان صاحب۔ پریسٹن " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۸۵
۶۷۔ محمد صادق خان صاحب " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۸۶
۶۸۔ ایم۔ اے۔ خان صاحب۔ برمنگھم " " " " "	۱۱۴/۷۲	۳۲۸۷
۶۹۔ نام اور پتہ ظاہر نہیں کیا گیا	۲۰۰/-	۳۲۸۸
۷۰۔ چوہدری محمد صدیق صاحب۔ معتمد بزمِ طلوعِ اسلام۔ راولپنڈی	۱۰،۰۰۰/-	۳۲۸۹
۷۱۔ چوہدری عبدالحمید صاحب " " " " "	۲۰۰/-	۳۲۹۰
۷۲۔ ملک ظہور احمد صاحب " " " "	۱۰۰/-	۳۲۹۱
۷۳۔ محمد یونس صاحب " " " "	۵۰/-	۳۲۹۲
۷۴۔ ریاض احمد قریشی صاحب " " " "	۱۰/-	۳۲۹۳
۷۵۔ حکیم ایم مظہر حسنین صاحب۔ کستوکی۔ گجرات	۱۰۰/-	۳۲۹۴
۷۶۔ حکیم دولت مند صاحب۔ فتح پور۔ سوات	۵۰/-	۳۲۹۵
۷۷۔ ڈاکٹر بشیر الحق صاحب۔ پیر سباق۔ نوشہرہ	۳۰/-	۳۲۹۶
۷۸۔ نصیر احمد خان صاحب۔ کراچی صدر	۱۰۰/-	۳۲۹۷
۷۹۔ محمد صدیق خان صاحب۔ ملتان	۱۰۰/-	۳۲۹۸
۸۰۔ محمد یوسف بٹ صاحب۔ مدینہ منورہ	۹۰۰/-	۳۲۹۹
۸۱۔ کے۔ صلاح الدین صاحب۔ ڈیفنس سوسائٹی۔ کراچی	۳۰۰/-	۳۳۰۰
۸۲۔ نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ راولپنڈی	۱۵،۰۰۰/-	۳۳۰۱
۸۳۔ عبدالرشید صاحب۔ خوشاب مرحوم " " " "	۵۰۰/-	۳۳۰۲
۸۴۔ چوہدری عبدالکریم صاحب۔ ننکانہ صاحب	۲۰۰/-	۳۳۰۳
۸۵۔ بیگم چوہدری عبدالکریم صاحبہ۔ ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۳۰۴
۸۶۔ احسان الحق صاحب۔ ننکانہ صاحب	۱۰۰/-	۳۳۰۵
۸۷۔ ماسٹر شیر دل صاحب۔ بذریعہ معتمد بزمِ طلوعِ اسلام۔ پشاور	۵۰/-	۳۳۰۶

میزان ۔ ۴۰،۳۶۱/۸۰ روپے

سابقہ میزان ۔ ۴،۴۷۹۱۸/۲۳ "

کل میزان ۔ ۴،۸۸۲۸۰/۰۳ روپے

کتاب التقدیر

انسان کی قسمت، خدا کی مشیت اور غریب کی تقدیر سے کیا مفہوم ہے؟ کیا موت کا دن مقرر ہے؟ بعض بچے پیدائشی اپاہج کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ دعا کیا ہے اور کیا اس سے تقدیر بدل جاتی ہے؟ اس قسم کے بیشمار سوالات ان کا جائزہ اور قرآن کریم کی روشنی میں ان کا حل آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔ کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

جلد مضبوط (نقشِ ثانی)

قیمت -/۳۰ روپے

قرآنی فیصلے (جلد چہارم)

طلوعِ اسلام کی مسلسل کاوش اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ افرادِ ملت نے اسلام کے متعلق غور و فکر سے کام لینا شروع کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دل میں مختلف قسم کے شکوک پیدا ہوئے اور اعتراضات ابھرنے لگے۔ یہ شکوک و اعتراض بیشتر اس اسلام کے پیدا کردہ تھے جو ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ یا اس تعلیم کے پیدا کردہ جو ہمارے سکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ طلوعِ اسلام نے اپنا فریضہ سمجھا کہ وہ ان شکوک کا ازالہ کرے اور ان اعتراضات کا جواب دے۔ چنانچہ طلوعِ اسلام کے پاس یہ سوالات آتے گئے اور یہ ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ اس قدر اہم تھا کہ اربابِ فکر و نظر کے تقاضے کے پیشِ نظر اسے الگ کتابی شکل میں شائع کرنا ضروری سمجھا گیا۔

اس نہایت اہم اور مقبول سلسلہ کا نام ہے

قرآنی فیصلے

جس کی تین جلدیں پہلے شائع ہو چکی تھیں اور چوتھی جلد اب شائع ہوئی ہے۔ اس میں سینکڑوں سوالات اور ان کے اطمینان بخش جوابات آ گئے ہیں۔ تفصیل میں جانے کی تو گنجائش نہیں۔ اس کے ان ابواب پر ایک نگاہ ڈالئے۔

① قرآن مجید ② نبوت، رسالت، احادیث ③ ہماری تاریخ ④ تقدیر
⑤ تصوف ⑥ علوم سائنس ⑦ عائلی زندگی ⑧ فرقہ بندی

ہر باب کے تحت بکثرت سوالات اور ان کے جوابات دیئے گئے ہیں ضخامت (پہلی تین جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ یعنی) ۴۲۴ صفحات۔ قیمت -/۱۵ روپے۔

(سابقہ جلدوں کی قیمت۔ جلد اوّل -/۱۰ روپے۔ جلد دوم -/۱۰ روپے۔ جلد سوم -/۱۰ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور ● (۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ) ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

149 SUTTON COURT RD
LONDON E-13—9NR.
PHONE 01—552—1517

لاہور میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰۰)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۳ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
حیات سرجری کلینک ۲۲۳ پیپلز کالونی I
(فون نمبر ۲۴۴۵۵)

کراچی ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ
بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی کراچی ۲ ۔ فون نمبر ۲۳۸۸۲۸

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۵/۱/۲ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ
چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بمکان۔ آغا
محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی
(فون ۲۳۶۵۹) مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ باڑہ روڈ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز ہر اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/ایل بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بمکان ڈاکٹر رضا محمد خان۔ نواب علی روڈ

جلال پور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی
میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۲۶۔ لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون ۳۱۰۷۱)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نماز مغرب
رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔ لیہ

پنج کسی (تحصیل کبیر والا ضلع ملتان) میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام
بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام

ہنگو میں درسِ قرآن (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ شام ساڑھے پانچ بجے بمکان محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ ہنگو۔ فون نمبر ۷۶

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقات کار حسب ذیل ہیں
ہر روز علاوہ جمعہ:۔ شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:۔ صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جا سکتی ہیں

محمد اسلم۔ کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام
کمرہ نمبر ۲۴۔ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی
کراچی ۲
(فون نمبر ۲۳۸۸۲۸)